جلد 28 شمارہ 6 ماہ جون 2026ء ذی الحج / محرم الحرام 1448ھ

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا

صداقت — اللہ — محبّت

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

ہے عرش بھی نیچا جو ہو پرواز مسلسل

ماہنامہ

فلاحِ آدمیّت

سلسلہ عالیہ توحیدیہ کا تعارف اور اغراض و مقاصد

- سلسلہ عالیہ توحیدیہ ایک روحانی تحریک ہے جس کا مقصد کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے مطابق خالص توحید، اتباع رسول، کثرت ذکر مکارم اخلاق اور خدمت خلق پر مشتمل حقیقی اسلامی تصوف کی تعلیم کو فروغ دینا ہے۔
- کشف و کرامات کی بجائے اللہ تعالیٰ کے قرب و عرفان اور اس کی رضا و لقاء کے حصول کو مقصود حیات بنانے کا ذوق بیدار کرنا ہے۔
- حضور ﷺ کے اصحاب کی پیروی میں تمام فرائض منصبی اور حقوق العباد ادا کرتے ہوئے روحانی کمالات حاصل کرنے کے طریقہ کی ترویج ہے۔
- موجودہ زمانے کی مشغول زندگی کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے نہایت مختصر اور سہل العمل اوراد و اذکار کی تلقین۔
- غصہ اور نفرت، حسد و بغض، تجسّس و غیبت اور ہوا و ہوس جیسی برائیوں کو ترک کر کے قطع ماسواء اللہ، تسلیم و رضا عالمگیر محبّت اور صداقت اختیار کرنے کو ریاضت اور مجاہدے کی بنیاد بنانا ہے۔
- فرقہ واریت، مسلکی اختلافات اور لاحاصل بحثوں سے نجات دلانا۔ تزکیہ نفس اور تصفیہ قلب کی اہمیت کا احساس پیدا کر کے اپنی ذات، اہل و عیال اور احباب کی اصلاح کی فکر بیدار کرنا ہے۔
- اللہ تعالیٰ کی رضا اس کے رسول ﷺ کی خوشنودی اور ملت اسلامیہ کی بہتری کی نیت سے دعوت الی اللہ اور اصلاح و خدمت کے کام کو آگے بڑھانا اپنے مسلمان بھائیوں کے دلوں میں قلبی فیض کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی محبّت بیدار کرنا اور روحانی توجہ سے ان کے اخلاق کی اصلاح کرنا ہے۔

ماہنامہ فلاحِ آدمیّت گوجرانوالہ

عالمگیر محبت اور بنی نوع انسان کی اصلاح و فلاح کا علمبردار

بیادِ
خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ
بانی سلسلہ

محمد صدیق ڈارؒ
بانی مجلّہ فلاحِ آدمیت

نگران و سرپرست اعلیٰ: جناب محمد یعقوب توحیدی
شیخ سلسلہ عالیہ توحیدیہ
0344-9000042

مجلس ادارت

مدیر: سید محمد عبداللہ بخاری 0301-7705388

معاون مدیر: شہزاد محمود بخاری 0301-7430525

نائب مدیر: سید رحمت اللہ شاہ 0333-4552212

شفیق احمد، وحید احمد، پیر خان
حافظ محمد یٰسین، عبدالقیوم ہاشمی
خالد محمود بخاری
ماجد محمود توحیدی

ترسیل: فہد محمود ، محمد ریاض

شیخ سلسلہ و مدیر سے رابطہ
مرکز تعمیر ملت (ڈاکخانہ سیکنڈری بورڈ) وحید کالونی کوٹ شاہاں گوجرانوالہ
ای میل: info@tauheediyah.com Ph: 055-3411030
Website www.tauheediyah.com

پبلشر عامر رشید انصاری نے معراج دین پرنٹرز مچھلی منڈی لاہور سے چھپوا کر مرکز تعمیر ملت، جی ٹی روڈ گوجرانوالہ سے شائع کیا

قیمت شمارہ -/50 روپے ❀❀❀ سالانہ فنڈ -/300 روپے

اس شمارے میں

پیامِ قرآن

وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ ۙ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ وَيَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ. (سورۃ الحدید 57: آیات 23-24)

اللہ ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتے ہیں اور فخر جتاتے ہیں جو خود بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بخل پر اکساتے ہیں۔

يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ أَنْ تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ۔ (سورۃ الممتحنہ 60: آیت 8)

اللہ تمہیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا برتاؤ کرو جنہوں نے دین کے معاملے میں تم سے جنگ نہیں کی ہے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا ہے۔ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا كَأَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَرْصُوصٌ۔

(سورۃ الصف 61: آیت 4)

اللہ کو تو پسند وہ لوگ ہیں جو اس کی راہ میں اس طرح صف بستہ ہو کر لڑتے ہیں گویا کہ وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔

فرمانِ نبوی ﷺ

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاصؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:
اے عبداللہ! فلاں کی طرح نہ ہو جانا، وہ رات میں عبادت کیا کرتا تھا پھر چھوڑ دی۔
(کتاب التہجد، صحیح بخاری)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ مجھے میرے جانی دوست (نبی کریم ﷺ) نے تین چیزوں کی وصیت کی ہے کہ موت سے پہلے ان کو نہ چھوڑوں۔ ہر مہینہ میں تین روزے، چاشت کی نماز اور وتر پڑھ کر سونا۔

(کتاب التہجد، صحیح بخاری)

حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ عورتوں نے نبی کریم ﷺ سے درخواست کی کہ ہمیں بھی نصیحت کرنے کے لئے آپ ﷺ ایک دن خاص فرما دیجئے۔ آنحضور ﷺ نے (ان کی درخواست منظور فرماتے ہوئے ایک خاص دن میں) ان کو وعظ فرمایا اور بتلایا کہ جس عورت کے تین بچے مر جائیں تو وہ اس کے لئے جہنم سے پناہ بن جاتے ہیں۔ اس پر ایک عورت نے پوچھا، حضور ﷺ اگر کسی کے دو ہی بچے مریں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ دو بچوں پر بھی۔
(کتاب جنازے کے احکام و مسائل، صحیح بخاری)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ کسی کے اگر تین بچے مر جائیں تو وہ دوزخ میں نہیں جائے گا اور اگر جائے گا بھی تو صرف قسم پوری کرنے کے لئے۔ ابوعبداللہ امام بخاریؒ فرماتے ہیں۔ (قرآن کی آیت یہ ہے) تم میں سے ہر ایک کو دوزخ کے اوپر سے گزرنا ہوگا۔

(کتاب جنازے کے احکام و مسائل، صحیح بخاری)

ندائے عارف

(فرمودات شیخ سلسلہ عالیہ توحیدیہ قبلہ محمد یعقوب صاحب توحیدی مدظلہٗ)

(ماجد محمود توحیدی)

☆ ایک سانس میں دو دفعہ شکر ادا کیا کرو کیونکہ ایک اندر جاتا ہے اس کا شکر ادا کر لیا اگر وہ باہر نہیں آئے گا تو پھر کیا کرو گے؟ باہر آئے تو اس کا بھی شکر ادا کیا کرو۔ اللہ کا شکر بہت ضروری ہے۔ اسی سے مخلص بندوں میں آدمی شامل ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں مخلص بندوں کے لئے شیطان کو کہا تھا کہ تم جو مرضی کرو میرے مخلص بندوں پر تمہاری حکومت نہیں چلے گی، وہ میرے ساتھ رہیں گے تو یہ وہی مخلص بندے ہوتے ہیں جو ہر دفعہ، ہر وقت اور ہر موقعے پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ یا اللہ! تیرا شکر ہے کہ تو نے ہمارے ساتھ اتنا احسان کیا ہے۔ ہمیں ایسی ایسی نعمتوں سے نوازا ہے کہ جن کا شمار کرنا مشکل ہے۔

☆ فرائض منصبی کی بات پر فرمایا:

ذوق وشوق سے اور اپنی تسلی کر کے کیا کرو۔ ہمیں یہی حکم ہے کہ جو فرائض منصبی ہیں انہیں بھی خوشی خوشی کرنا ہے، ذوق وشوق سے کرنا ہے۔ انہیں بوجھ نہیں سمجھنا۔ ہم نے ایسے ہی چلنا ہے کہ سب کچھ خوشی خوشی کرنا ہے۔

ایک بھائی نے اپنی بات کی تو فرمایا:

میرا خیال ہے کہ پوری دنیا میں حلال کا رزق کمانا سب سے مشکل کام ہے۔

یہ جو شق اللہ نے دی ہے کہ حلال کھایا کرو۔ یہ صحیح مجاہدہ ہے۔ آپ کریں اور دیکھیں تو آپ کو حلال کا رزق کھانا سب سے مشکل کام نظر آئے گا۔ اس میں آپ کے اخلاق کا تزکیہ ہوگا تو حلال رزق ملے گا، اس کے بغیر نہیں ملتا۔

☆ پتا نہیں کہ یہ اللہ کا خاص کرم ہے اور اقبال نے بھی کہا ہے کہ

اسلام کی فطرت میں قدرت نے لچک دی ہے
اتنا ہی یہ ابھرے گا جتنا کہ دباؤ گے

یہ واقعی میں نے نوٹ کیا ہے کہ واقعی کہیں جہاد کا یا کوئی کتاب ایسی پڑھیں یا کوئی بات کرے تو آدمی کی Tune ہی بدل جاتی ہے، رنگ ہی Change ہو جاتا ہے، اس وقت سارے ایسے ہو جاتے ہیں کہ جیسے ابھی کہیں جہاد ہو رہا ہے۔ آپ لوگوں نے یہ بات محسوس کی ہے؟

میں نے یہ محسوس کی ہے کہ جہاں کوئی ایسی بات ہوتی ہے تو خون جوش میں آ جاتا ہے۔ یہ قدرت نے دیا ہے لیکن ہم اپنا فرض بھول چکے ہیں۔ اب ہم وہن کا شکار ہو چکے ہیں۔ میں جب بھی حضور اقدس ﷺ کی اس حدیث پر نگاہ ڈالتا ہوں تو میں کہتا ہوں کہ کتنی زبردست بات ہے کہ جنہوں نے ایسی نبض شناسی کی ہے کہ آج کل پوری قوم اسی میں مبتلا ہے، دوسرا کوئی کام ہی نہیں ہے۔

پتا ہے ناں کہ وہن کا شکار ہو جانا کیا ہے؟ آج ہم اگر کسی چیز سے ڈرتے ہیں تو وہ موت ہے۔ اگر کسی چیز کی خواہش ہے اور شدید سے شدید تر ہے تو وہ دنیا ہے۔ دنیا داری ہے ان دونوں چیزوں میں جو مبتلا ہوگا وہ وہن کا شکار ہوگا اور ان کا انجام حضور اقدس ﷺ نے جو فرمایا وہ یہ ہوگا کہ یہ اپنے گھروں میں سکون سے بیٹھے ہوں گے اور دشمن ایسے ان کے گھروں

میں انہیں مارنے کے لئے آئیں گے جیسے انہوں نے اُن کی دعوت کی ہے، ایسے آئیں گے۔ ہم لوگوں کو شرم ہے نہ حیا۔ ہم لوگ یہ بات بھول گئے ہیں کہ یہ کتنی حقیقت بتا دی۔ میرا خیال ہے کہ کوئی تیس پینتیس لاکھ ہیں سارے یہودی۔ انہوں نے پورے دو ارب کو ایسے نشانے پر لگا کر رکھا ہوا ہے کہ بے غیرت ثابت کر دیا ہے۔ انہوں نے ثابت کر دیا ہے کہ بے غیرت ہیں اور ہم لوگوں میں اب بھی بالکل عقل نہیں ہے کہ ہم کیا ہیں؟ ہمیں کیا کرنا چاہئے؟ یہودی دن بدن چڑھتے جا رہے ہیں۔ خود تو وہ سمجھ چکے ہیں کہ یہ بے غیرت ہو گئے ہیں ساتھ پوری دنیا پر ثابت کر دیا ہے کہ دوسرے بھی کہیں کہ یہ کیا مسلمان ہیں؟ آئے دن کوئی نہ کوئی موبائل میں Message بھیجتا رہتا ہے۔ ایسے ہی ایک آیا کہ خواتین نے جلوس نکالا کہ مسلمانو! غیرت کرو۔ میں حیران رہ گیا۔ وہ بڑھیا سی تھی اس نے امریکہ میں بینر اٹھایا ہوا تھا جس پر لکھا تھا کہ مسلمانو! غیرت کرو۔

یہ الفاظ میں نے پڑھے کہ دیکھو یار! یہ مسلمانوں کی حالت ہے۔ پوری دنیا میں بے غیرت ہو گئے ہیں، مشہور ہو گئے ہیں۔ ہماری ہوا سے ہی جہاں پتا چلتا تھا کہ اسلامی فوج حرکت میں آ گئی ہے وہاں پوری دنیا لرزے میں آ جاتی تھی اور آج ہماری یہ حالت ہے۔

☆ بات ہوئی کہ مولانا حضرات اور انشورنس کمپنی کے پاس بھی سارے Package مرنے کے بعد کے ہوتے ہیں۔ کیا اب ہم بھی دیدار باری تعالیٰ کا Package مرنے کے بعد کا دینے لگے ہیں؟ جس کی ہم بات کرتے ہیں۔ اس پر فرمایا:

آپ جہاں تک جانا چاہتے ہیں، اسی رفتار سے، اسی حوصلے سے، اتنی ہمت اور اتنی ہی پاکیزگی سے آپ عمل کریں اور زندگی میں دیکھ لیں، دو دن میں دیکھ لیں۔ اب جیسے میں چل رہا ہوں ایسے تو پتا نہیں مرنے کے بعد بھی اللہ میاں اپنی مرضی سے سامنے آ جائے تو

آجائے ورنہ اس کی مرضی ہے، وہ مالک ہے۔ یہ تو اپنے عمل کی بات ہے بچو۔

ہمارے ہاں ان کے علاوہ بھی Package ہے اگر آپ Package کی بات کرتے ہیں تو آپ ذرا انصاری صاحبؒ کی 'تعمیر ملت' ایک دفعہ پھر پڑھیں۔ انہوں نے کیا کیا لکھا ہے کہ یہاں آپ کو اس تعلیم پر عمل کرنے سے کیا کیا ملتا ہے۔ آپ انسان سے فرشتے بن جاتے ہیں اور فرشتوں سے بھی آگے نمبر لے جاتے ہیں۔ کیا کیا بن جاتے ہیں رہی وہ بات اللہ تعالیٰ سے ملنے کی، وہ تو خصوصی Package ہے۔ اس کے لئے عمل شرط ہے بس۔ عمل اور اپنا جو کردار ہے اس میں آپ فرشتوں سے افضل ہو جائیں پھر اللہ میاں سامنے آئے گا۔ فرشتوں سے ہیں تو افضل لیکن Practically افضل ہو جائیں کہ آپ کی زبان سے کوئی بات ایسی نہ ہو، آپ کا کوئی قدم ایسے رستے پر نہ چلے، آپ کا ہاتھ کسی مکروہ چیز کی طرف نہ بڑھے، آپ کی نظریں کہیں نہ پڑیں۔ آپ بالکل ہنستے کھیلتے بھی رہیں، خوش و خرم بھی رہیں اور ان ساری چیزوں کے پابند ہو جائیں تو دیکھو اللہ سامنے آتا ہے کہ نہیں آتا۔

بچو! Package تو تمہارا ہے۔ باقی لوگوں کا کیا ہے؟ انشورنس والے کیا بیچتے ہیں؟ اور دوسرے کیا بیچتے ہیں؟ Package تو تمہارا ہے۔ اس میں تھوڑا کچھ کرنے سے بھی آپ کو وہ کچھ مل جاتا ہے جس کا تصور بھی دوسرے لوگ نہیں کر سکتے۔ میرا خیال ہے کہ انصاری صاحبؒ کی بدولت ہمیں یہ آگاہی تو ہوئی ہے کہ یہ سب کچھ رائیگاں نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ میں فلاں پیر صاحب سے بیعت ہو گیا ہوں، اب میں جو مرضی آئے کروں، میں قیامت کے دن ان کے جھنڈے کے نیچے آجاؤں گا اور میری بخشش ہو جائے گی۔ ایسی ساری باتیں ہمارے لئے تو اب واضح ہو گئی ہیں کہ یہ خواہ مخواہ وقت کا ضیاع ہے۔ اللہ نے ہمیں رستہ بھی دکھایا، وہ بندہ بھی دیا جس نے رستہ دکھایا اور دکھایا بھی ایسا کہ اس میں اب کوئی شک و

شبے کی الحمد للہ بات ہی نہیں رہی۔ باقی جو کسر ہے یہ ہماری اپنی ہے۔ ویسے یہ کسر بھی کوئی نہیں ہے۔ یہ باباجیؒ جیسے شخص کہ جس نے تین سال میں اپنے تین امتحان فیل کر دیئے، اتنی محنت کی، اس کے باوجود بھی انہیں ساٹھ سال میں کہیں جا کے دیدار ہوا۔ اتنی زبردست محنت کے بعد، ایسے Dedicated کہ دن رات ایک کر کے۔ ہم کس گنتی میں ہیں؟ ہم تو کچھ بھی نہیں کرتے۔ اس لئے اگر دیر سویر ہو جاتی ہے تو اس کو کمزوری مت سمجھیں یا اس کو ناکامی مت سمجھیں۔ امید پوری رکھیں اور عمل کیے جائیں۔ امید پوری رکھیں اور یقین کیے جائیں کہ اللہ تعالیٰ کبھی بھی آپ کو پیچھے نہیں چھوڑے گا، جب تک آپ الرٹ ہیں، آپ قدم آگے بڑھا رہے ہیں۔

بچو! یہ بہت بڑا رستہ ہے۔ یہ قدموں میں، میٹروں میں اور کلومیٹروں میں ختم ہونے والا نہیں ہے۔ بہت لمبا رستہ ہے۔ بقول باباجیؒ کے وہ مرنے کے بعد بھی۔ یہ مرنے والی بات تو آپ نے ختم ہی کر دی تھی لیکن میں پھر بھی کہتا ہوں کہ وہاں بھی مل جائے تو کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے۔ بہت اچھی بات ہے۔ باباجیؒ نے یہ کہا کہ جو اس رستے پہ چلتے چلتے مر جاتا ہے تو اس کا انجام اللہ کی گود کے علاوہ کہیں نہیں ہوگا۔ تو ایسی موت کسے نہیں چاہیے؟ ہمیں تو ایسی موت مل جائے تو یہ بہت بڑی غنیمت ہوگی۔ ملے گی انشاء اللہ۔ اللہ تعالیٰ رحیم وکریم ہے۔ وہ ہمیں ایسے نہیں چھوڑے گا۔ دعویٰ جو کر لیا ہے کہ ہماری دوستی ہے تو وہ اللہ کا فضل وکرم ہے کہ وہ دوستوں کو چھوڑنے والا نہیں ہے۔ وہ دوستوں کو نہیں چھوڑتا۔

☆ اللہ اللہ کیا کرو تا کہ زندوں میں آ جاؤ۔ مردوں سے نکل جاؤ اور زندوں میں آ جاؤ۔ اللہ اللہ کیا کرو۔ ہم کوئی اتنا لمبا چوڑا ٹائم بھی نہیں مانگتے مختصر سا ٹائم ہے، چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے اللہ کو ایسے یاد کرو کہ تم جو کچھ کر رہے ہو اللہ میاں دیکھ رہا ہے

اورتمہارا دل اللہ اللہ کر رہا ہے۔ بس اتنا۔ اور وہ شام کی کسی نماز فجر، مغرب یا عشاء کی نماز کے بعد دس پندرہ منٹ یہ لا الہ الا اللہ کا ذکر کر لیا کرو۔ یہ اتنا ہی دس پندرہ منٹ لیتا ہے اور کوئی ٹائم ہم نہیں لیتے۔ تھوڑا سا وقت لگاؤ اور دیکھو کہ توحید یہ سلسلہ آپ کو کیا Reward کرتا ہے۔ اللہ اللہ کرو، اس سے پیچھے نہیں ہٹنا۔ اللہ کہتا ہے کہ

نَحْنُ أَوْلِيَاؤُكُمْ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَفِي الْآخِرَةِ۔ (سورۃ فصلت 41: آیت 31)

میں دنیا اور آخرت میں تمہارا دوست ہوں۔ یہ تو کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ اللہ نے ڈنکے کی چوٹ پہ قرآن میں لکھ دیا ہے کہ میں دنیا اور آخرت میں تمہارا دوست ہوں۔ توحیدیوں کو اللہ دنیا اور آخرت دونوں میں نوازتا ہے۔ یہ باباجیؒ نے کہا۔ میں نے اپنے کئی دوست دیکھے ہیں جو اللہ کے فضل سے باباجیؒ کی اس پیشین گوئی پر اور اس Comment پر پورے اترے ہیں۔ الحمد للہ۔ اللہ کا بڑا کرم ہے۔ ہمیں اللہ کی ذات پر یقین رکھنا چاہئے اور عمل جو اصل بات ہے، وہ عمل کرنا چاہئے اور بے لوث عمل، کسی معاوضے کے لئے نہیں، بے لوث عمل ہو بس ان شاء اللہ کامیابی تمہارے قدم چومے گی۔

راہ سلوک میں سب کچھ اللہ کے کرم سے ہی ہوتا ہے۔ یہ عمل تو میں نے ویسے ہی کہہ دیا تھا لیکن اب بھی کہتا ہوں کہ عمل ضروری ہے لیکن جس بات کی نشاندہی آپ کر رہے ہیں یعنی دیدار باری تعالیٰ تو وہ اللہ کے کرم سے ہی ہوگا۔ ہماری محنت پر وہ Depend ہی نہیں کرتا۔ تو وہ کرم کب کرتا ہے، کس سٹیج پر کرتا ہے، آج کر لے تو کر لے، مالک ہے اور اگر مرتے وقت کرے تو اس وقت بھی مالک ہے۔ بہر حال ہمارا یہ ایمان ہونا چاہئے کہ اللہ جب بھی کرم کر لے اسی میں ہماری بہتری ہے۔ ایمان اسی پر ہونا چاہئے۔ اصل میں اللہ

کرم جب کرتا ہے بات اسی وقت ہی اچھی لگتی ہوتی ہے۔ یہ ایمان رکھیں کہ اللہ جو کرتا ہے ہماری بہتری کے لئے کرتا ہے، پیچھے نہیں ہٹنا۔ باقی وہ جو ٹائم والی بات ہے تو اللہ کے ہاں ٹائم سکیل کوئی نہیں ہے، جب اس کا کرم ہوا، دل میں آئی تو سامنے آجائے گا۔

عمل ایسا ہو کہ آپ کی اندرونی حالت آپ کے عمل سے جھلکے۔ کتنے پیار سے، کتنی محبت سے، کتنی طلب سے آپ یہ عمل کرر ہے ہیں۔ آپ کا مطمعٔ نظر کیا ہے، اس پر آپ نے نظر ٹکائی ہوئی ہے اور اپنا سارا کچھ بیچ کر آگے بڑھ رہے ہیں تو یہ اللہ میاں دیکھتا ہے۔ اللہ میاں کو اس کی احتیاج نہیں ہے۔ یہ آپ سمجھتے ہیں ناں؟ اس کی احتیاج اللہ کو نہیں ہے لیکن اس کے باوجود اللہ کو یہ خواہش ہے کہ لوگ جو کچھ کریں وہ اس بہترین طریقے سے کریں۔ اللہ تو جانتا ہے کہ میں نے جو کچھ کرنا ہے وہ تو اپنی مرضی سے کرنا ہے، اب کروں، سال بعد یا دس سال بعد کروں، وہ میری اپنی مرضی ہے۔ وہ اللہ کی اپنی مرضی ہے اور اسی میں ہماری بہتری ہے۔ یہ اپنا ایمان رکھیں کہ اللہ جو کرتا ہے اسی میں ہماری بہتری ہوتی ہے۔

ایک بھائی نے کہا کہ قبلہ انصاری صاحبؒ نے بڑی اچھی بات کی ہے کہ طلب ایسی ہو کہ نہ کھانے میں مزا آئے، نہ پینے میں، نہ کچھ اور کرنے میں۔ اس پر آپ نے فرمایا:

کیا آج ہم میں ایسی طلب ہے؟ جو باباجیؒ نے لکھا ہے کہ نہ کھانے میں مزا آئے، نہ سونے میں مزا آئے نہ کسی سے بات کرنے میں مزا آئے۔ طلب ہو تو ایسی ہو۔ ہمارے بھائیوں میں آج کل شاید کوئی ہو لیکن ہم میں تو ایسی طلب اب تک پیدا نہیں ہوئی۔

ایک بھائی نے کہا کہ ہمیں بس یہ پتا لگ گیا ہے کہ طلب میں ایسا ہونا چاہیے تو اب آگے کام اللہ خود ہی کردے، وہ طلب بھی پیدا کردے۔ اس بات پر مسکرائے اور فرمایا:

ہاں صحیح بات ہے۔ جب ہم مانگتے ہیں تو نتیجہ یہی ہونا ہے کہ اللہ جو کچھ ہم مانگتے ہیں،

ہم میں جو تبدیلی لانی ہے تو نے ہی لانی ہے، تو لے آ، آپ لے آ، اس میں دیر کیوں کر رہا ہے۔ تو یہ بھی صحیح بات ہے کہ جو کچھ کرنا ہے وہ اللہ نے خود کرنا ہے اس میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔

☆ ایک بھائی کی طرف سے کچھ رقم مرکز پر موصول ہوئی جو ایک اندازے کے مطابق حلقہ فنڈ سے قدرے زیادہ تھی۔ ان سے مخاطب ہو کر فرمایا:

جتنا مقرر ہے بس وہی ملتا رہے تو وہ بہت ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا کام بھی چلے اور بھائی بھی خوش رہیں۔ بھائیوں کے ماتھے پر تیوریاں آئیں تو یہ ہمیں پسند نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ بھائیوں کو خوش رکھے کہ اس کے ساتھ ساتھ اپنا حصہ ڈالتے جائیں۔ یہ بہت ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو یہ جو آپ نے پیش کیا ہے اس کی جزا دے اور آپ کی روزی رزق میں مزید برکت عطا فرمائے۔

☆ آپ جب کسی بھائی کی بیمار پرسی کے لئے جاتے ہیں اور جتنا وقت وہاں رکتے ہیں تو اللہ میاں کے اس وقت آپ سب سے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔ اس سے بڑی بات اور کیا ہوگی؟ آپ جتنی دیر وہاں بیٹھیں آپ کو اللہ کا قرب نصیب ہو جائے۔ یہ کتنی بڑی بات ہے بلکہ ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان پر جو حق ہے ان میں یہ شامل ہے کہ جب بیمار ہو تو اس کی بیمار پرسی کریں، جب ملے تو سلام کریں، جب وفات ہو جائے تو جنازہ پڑھیں۔ یہ ایک مومن کے دوسرے مومن کے ذمہ حق ہیں۔ ان کا خیال رکھنا پڑتا ہے اور رکھنا چاہئے۔

☆ یہود نے جب سے نافرمانی کی اسی زمانے سے انہیں مغلوب کر دیا گیا ہے۔ اب بھی یہ ان کی کامیابی نہیں ہے۔ اللہ کا یہ فیصلہ ہے کہ یہ ذلیل ہوں گے لیکن جب آپ لوگوں میں مردانگی آئے گی، ایمان آئے گا تو یہ خود بخود ذلیل ہو جائیں گے۔ ان کے متعلق یہی

اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے کہ یہ ہمیشہ مغضوب رہیں گے۔ یہ مغضوب ہیں۔ یہ اب سے نہیں موسیٰؑ کے زمانے سے مغضوب ہیں۔ اب بھی یہ کسی کے بل بوتے پر آگے آئے ہوئے ہیں، اپنے طور سے نہیں ہیں۔ پورا یورپ اور پورا امریکہ ان کے پیچھے ہے۔ ان کے ساتھ کھڑا ہے۔ ان کے ساتھ ہے۔ اس لئے یہ اتنی ہمت کر رہے ہیں۔ ہمارا ایمان ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں ذلیل کرے گا لیکن ہمیں پہلے انسان بننا پڑے گا۔ ہم انسان بنیں تو ان کے ذلیل ہونے میں پھر کوئی دیر نہیں ہے لیکن ہمیں انسان بننا پڑے گا۔ ہم انسان بن گئے تو یہ چلے جائیں گے۔

آپ اس غلط فہمی میں مت رہیں کہ یہ اب ایسے ہوئے ہیں کہ مسلمانوں کو تنگ کرتے ہیں۔ قرآن میں بھی یہ ہے کہ یہودیوں کی نسبت عیسائی آپ کے زیادہ قریب ہیں۔ جو یہودی ہیں یہ پہلے اللہ تعالیٰ کی بڑی انعام یافتہ قوم تھی لیکن ان کے کرتوت ایسے تھے کہ یہ ہر دفعہ اللہ کے حکم کی مخالفت کرتے تھے چنانچہ موسیٰؑ کے زمانے سے ہی انہیں اللہ نے ذلیل کر دیا۔ کسی کو بندر بنادیا اور کسی کو کیا بنادیا۔ اس وقت سے ہی یہ مغضوب ہیں اور مغضوب ہی رہیں گے۔ قرآن دوٹوک گواہی دے رہا ہے کہ یہ مغضوب ہیں اور مغضوب ہی رہیں گے۔ ان کی فکر آپ مت کریں۔ اپنے آپ کی فکر کریں، دل رکھیں، حوصلہ پکڑیں۔ آپ کھڑے تو ہو سکیں۔ آپ کھڑے ہی نہیں ہوتے، وہ چڑھے جارہے ہیں۔ کوئی کمزور سے کمزور آدمی بھی اگر کسی پہلوان کے سر چڑھ جائے اور وہ پہلوان کھڑا ہے تو وہ اسے چھوڑے گا؟ وہ اس کا سر نوچ کے چھوڑے گا۔ وہ تو اس لئے Aggressive ہیں کہ ہم لیٹ گئے ہیں۔ ہم اٹھ کے کھڑے ہوں تو پھر ہم دیکھتے ہیں کہ وہ کیسے کھڑا ہوتا ہے۔ اس کا باپ بھی کھڑا نہیں ہو سکتا ہے ہم لیٹے ہوئے ہیں تو وہ کہتا ہے کہ لیٹے ہوئے ہیں تو مارو ان کو۔ یہ ہو رہا ہے۔

(آن لائن محفل مورخہ 09 جون 2024ء کی گفتگو سے اقتباسات)

نظریۂ وحدت الوجود کا تنقیدی جائزہ

(حضرت خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ)

آیئے اب ساتویں جواب پر غور کریں یہ جواب ہے وحدت الوجود اور اس کے ماننے والوں کو وجودی کہتے ہیں۔ اسلام کو اس نظریئے سے متعارف کروانے والے حضرت محی الدین ابن عربی معروف بہ شیخ اکبر رحمۃ اللہ علیہ ہیں تاہم یہ نظریہ شیخ اکبرؒ کی تخلیق یا دریافت نہیں ہے۔ یہ نظریہ تو خود اسلام کے وجود میں آنے سے ہزارہا سال پہلے ہندوؤں کے اپنشدوں میں موجود تھا، اور آج سے تقریباً پانچ ہزار سال پہلے کرشن نے جو ہندوؤں کے غالباً سب سے بڑے اوتار مانے جاتے ہیں، مہابھارت یعنی کورو اور پانڈوؤں کی جنگ کے زمانہ میں پانڈوؤں کو اس کا اپدیش دیا تھا جو آج بھی گیتا کے صفحات میں موجود و محفوظ ہے۔ چونکہ عباسی خلیفہ مامون الرشید کے زمانہ میں یونانی، لاطینی اور سنسکرت کی بے شمار کتابوں کا ترجمہ عربی زبان میں ہو چکا تھا اور حضرت ابن عربیؒ کے زمانہ میں وہ آسانی سے دستیاب ہو سکتی تھیں معلوم ایسا ہوتا ہے کہ حضرت شیخ اکبرؒ کو کسی ایسے اپنشد کا عربی ترجمہ کہیں سے مل گیا ہوگا جس میں مسئلہ وحدت الوجود پر بحث کی گئی تھی اور وہ چونکہ منطق و فلسفہ اور علم و ادب کے عالم متبحر تھے، اُنہوں نے اس مسئلہ پر خوب غور وخوض کیا، یہاں تک کہ وہ ان کے دل و دماغ میں رچ بس گیا۔ اب چونکہ وہ ایک بہت بلند مرتبہ ولی اللہ اور صوفی بھی تھے اس لیے جب وہ سلوک طے کرتے ہوئے اس مقام پر پہنچے جہاں سالک کو وحدت الوجود کی کیفیت سے واسطہ پڑتا ہے اور وہاں ان پر وہی کچھ مشہود و مکشوف ہوا جس پر وہ پہلے سے یقین رکھتے تھے تو انہوں نے اس مقام کو سلوک کی آخری منزل اور کیفیتِ وحدت الوجود کو حقیقت سمجھ لیا اور عوام کے سامنے

اسی کا اظہار فرمانے لگے۔ یہ مقام جہاں سالک کو وحدت الوجود کی کیفیت سے سابقہ پڑتا ہے، کیا ہے اور کہاں ہے، وہاں سالک کیا دیکھتا ہے اور کشف سے اس پر کیا کچھ کھلتا ہے۔ اس کا بیان ہم ان شاء اللہ آگے مناسب موقع پر کریں گے۔ آیئے اب اصل جوب کی طرف رجوع کریں۔

سوال ہے کہ کیا یہ کائنات ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی یا یہ پیدا کی گئی ہے اور فنا ہوجائے گی اگر یہ پیدا کی گئی ہے تو اس کا پیدا کرنے والا کون ہے، کیسا ہے، کہاں ہے اور اس کا اس کائنات سے کیا رابطہ اور تعلق ہے۔

اب وجودیوں کا جواب یہ ہے کہ ''وجود ایک ہے اور وہی اللہ ہے۔ کائنات میں جو اشیاء ہمارے حواسِ ظاہر و باطن سے محقق و معلوم یا محسوس و مدرک ہوتی ہیں وہ اللہ کی ذات کی تجلیات ہیں اور ذات و تجلیات میں وہی تعلق ہوتا ہے جو موصوف و صفت میں ہوتا ہے اور یہ کہ ذات و صفات ایک دوسرے کی عین ہیں یعنی ایک ہی ہیں''۔

پچھلے صفحات میں یہی جواب ہم نے کسی قدر مختصر لکھا ہے اور اس کی تھوڑی سی تصریح بھی کردی ہے۔ یہاں مزید تصریح کی ضرورت نہیں۔ یہاں تو ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ پچھلے صفحات میں مادّہ پرستوں کا جو جواب تحریر کیا گیا ہے اس میں اور وجودیوں کے جواب میں مطلق کوئی فرق نہیں ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ وجودی بھی اس لحاظ سے مادّہ پرست ہیں، اب جوابات ملاحظہ ہوں۔

(ا) مادّہ پرست کہتے ہیں: وجود ایک ہے اور وہ مادّہ ہے جو قدیم ہے۔

وجودی کہتے ہیں: وجود ایک ہے اور وہ اللہ ہے جو قدیم ہے۔

(ب) مادّہ پرست کہتے ہیں:

مادّہ میں جو حرکت، تغیر و تبدل اور صور و اشکال پائی جاتی ہیں وہ مادّہ کا طبعی خاصہ ہے۔

وجودی کہتے ہیں:

(۲) وجود میں جو حرکت، تغیر وتبدل اور صور واشکال پائی جاتی ہیں وہ اللہ کی تجلیات ہیں۔

اب اگر ہم اللہ کی جگہ مادہ اور تجلیات کی جگہ طبعی خاصہ کے الفاظ رکھ دیں تو دونوں کے جو اب بالکل ایک ہیں، علاوہ ازیں چونکہ وجودی کائنات کو اللہ کا عین یعنی اللہ ہی مانتے ہیں۔ اس لیے ان کے جواب کا یہ مطلب بھی ہوا کہ کائنات ہی ازلی وابدی ہے یعنی قدیم ہے اور یہی مادّہ پرست بھی کہتے ہیں۔

یہ نظریہ چونکہ اسلامی عقائد اور وحی کے خلاف ہے اس لیے علمائے شریعت نے بجا طور پر اس کے خلاف سخت قدم اٹھایا۔ انہوں نے بے شمار تقریروں اور تحریروں میں اس کو رد کیا اور اس کے خلاف بہت سی مبسوط کتابیں بھی لکھیں۔ دوسری طرف بہت سے صوفی حضرات نے اس کی تائید میں بہت سے مضامین اور کتابیں تحریر کیں۔ اس طرح بحث وتمحیص کا ایک ایسا لامتناہی سلسلہ شروع ہوگیا جو آج تک بھی کلیۃً ختم نہیں ہوسکا۔ اگرچہ پہلا سا زور شور اب نہیں ہے پھر بھی چھیڑ چھاڑ تو ہوتی ہی رہتی ہے۔ موافق لکھنے والوں میں جو بزرگ قابلِ ذکر ہیں ان میں سے بہ خوف طوالت صرف چند حضرات کے اسمائے گرامی دیئے جاتے ہیں جو یہ ہیں: علامہ جلال الدین سیوطیؒ، شیخ فخر الدین رازیؒ، مولانا جامیؒ، مجد الدینؒ فیروز آبادی صاحب قاموس، قطب الدین الحمویؒ، صلاح الدین الصفدیؒ، عبدالرزاق الکاشانیؒ وغیرہ وغیرہ مخالف لکھنے والوں میں سے چند ایک بزرگ یہ ہیں علامہ ابن تیمیہؒ، ابن خلدونؒ، علامہ ابن حجرؒ، علامہ ذہبیؒ، ابن المقریؒ، ابراہیم البقاعیؒ اور امام ربانی حضرت مجدد الف ثانیؒ وغیرہ۔

ان بزرگوں کے علاوہ متاخرین میں بہت سے حضرات نے اس نظریہ کے موافق اور مخالف لکھا ہے۔ موافق لکھنے والوں میں حضرت شاہ ولی اللہؒ اور ان کے متبعین خاص طور پر

قابل ذکر ہیں لیکن شاہ صاحب نے دوٹوک کوئی فیصلہ کرنے کی بجائے شیخ اکبرؒ کے نظریہ وحدت الوجود اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے نظریہ وحدت الشہود میں تطابق پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ اصل میں دونوں نظریئے ایک ہی حقیقت کے دو نام ہیں۔ مخالف لکھنے والوں میں خواجہ ناصر عندلیبؒ اور ان کے صاحبزادے حضرت میر دردؒ کا نام قابلِ ذکر ہیں۔ ان دونوں حضرات نے حضرت شاہ ولی اللہؒ کی توضیع کو رد کر کے نظریہ وحدت الوجود کو باطل ثابت کیا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ ہم نے جو کچھ لکھا ہے اپنے کشف وشہود کی بنا پر لکھا ہے، ان کے علاوہ اور کسی نے یہ دعویٰ نہیں کیا۔ اس سارے قضیہ میں سب سے مزے کی بات یہ ہے کہ حضرت ابنِ عربیؒ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ اور خواجہ ناصر و میر دردؒ کے سوائے جتنے بھی لکھنے والے ہیں خواہ موافق ہوں یا مخالف سب کے سب یا تو متکلمین ہیں یا متصوفین۔ صوفی بھی ہیں لیکن جہاں تک ہمیں علم ہے ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس نے ذات بحت تک سلوک طے کر کے حقیقت کو خود اپنے کشف وشہود سے معلوم کیا ہو، صرف استدلال عقلی و منطقی سے لکھا ہے جو کچھ لکھا ہے اور یہ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ ''اگر زیر تحقیق شے ایسی ہو جو نہ تو حواس ظاہری سے معلوم و محقق ہو سکے، نہ عقل میں آ سکے، نہ انسان کا علم اس کو محیط ہو سکے تو ایسی صورت میں محض استدلال عقلی سے جو کچھ معلوم ہو گا صرف انسانی تخیل اور تفکر کی تخلیق ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی تائید میں عقلی اور علمی دلائل بھی موجود ہوں اور انسانی ذہن منطقی استدلال کی بنا پر اسے ماننے پر مجبور بھی ہو جائے پھر بھی پورے وثوق اور یقین سے کون کہہ سکتا ہے کہ وہ تحقیق سو فیصدی درست ہے۔'' یہ بات مسئلہ وحدت الوجود کی تحقیق پر حرفاً حرفاً صادق آتی ہے۔ یہاں زیر تحقیق شے اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جو نہ حواس ظاہری سے معلوم و محسوس ہو سکتی ہے نہ عقل اس کا ادراک کر سکتی ہے نہ علم سے اس کا احاطہ کیا جا سکتا ہے۔

دریں صورت محض عقلی استدلال سے اس کی بابت جو کچھ ثابت کیا جائے کون کہہ سکتا ہے کہ وہ سو فیصد درست ہے۔ بعض معترضین تو اس بارے میں یہاں تک کہہ گزرے ہیں کہ جس شخص کو خود کشف و شہود نہ ہوتا ہو اس کو یہ حق ہی نہیں کہ وحدت الوجود یا ایسے دوسرے مسائل پر کچھ کہے لیکن یہ ان معترضین کی زیادتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے علم اور عقل انسان کو دیا ہی اس لیے ہے کہ ان دونوں کی مدد سے جو کچھ سمجھ میں آئے بے خوف وخطر بیان کرے۔ لیکن ساتھ ہی ان لوگوں کے مخالفین کو بھی یہ حق حاصل ہے کہ وہ ان کی تحقیق پر تنقید و اعتراض کریں اس سے کوئی نقصان نہیں ہوتا بلکہ مسئلہ زیرِ تحقیق اس چھان بین کی وجہ سے صاف ہوتا چلا جاتا ہے اور ذہن انسانی کی ترقی رکنے نہیں پاتی۔ عقلی مسائل تو رہے ایک طرف، ہم تو یہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی بزرگ اپنے کشف و شہود کی بناء پر کوئی بات کہتا ہے تو ہر صاحب علم اور صاحب نظر کو یہ حق حاصل ہے کہ اس پر تنقید کرے اور اس کو خوب پرکھے اگر ایسا نہ کیا جائے تو اس سے یہ نقص پیدا ہوگا کہ اگر کوئی شخص اپنے کشف و شہود کی بنا پر کوئی ایسی بات کہے جو وحی یعنی قرآن کے صریحاً خلاف ہو تو علمائے شریعت محض اس وجہ سے کہ ان کو کشف و شہود کی سعادت حاصل نہیں ہے اس شخص کی بات کا کوئی جواب نہ دے سکیں گے اور مسلمانوں میں کفر و الحاد کے پھیلنے کو نہ روک سکیں گے۔ دیکھئے کشف و شہود بھی ہمیشہ درست نہیں ہوا کرتا اس میں بھی کبھی کبھی غلطی ہو جاتی ہے اور غلطی نہیں تو غلط فہمیاں تو کثرت سے ہوتی ہی رہتی ہیں۔ اس لیے مسلمانوں کا فرض ہے کہ کسی شخص کے کشف و شہود کی صرف اس بات کو صحیح سمجھیں جو وحی کے خلاف نہ ہو۔

لطیفہ: ایک ہمارے چشتیہ خاندان کے پیر بھائی تھے جو صوفی جی کے نام سے مشہور تھے، اکثر میرے پاس تشریف لاتے تھے، وہ صاحب اجازت تھے اور ان کے بہت سے مرید بھی تھے، ایک دن میرے پاس آئے تو میں گھر سے باہر درخت کے نیچے بیٹھا تھا وہ بھی وہیں

بیٹھ گئے ۔کچھ دیر بعد چائے آئی اور ہم چائے پینے لگے ۔چائے پیتے پیتے صوفی جی کے چہرے پر کیفیت کے آثار نمایاں ہوئے ،چہرہ سرخ ہوگیا،آنکھوں میں لال لال ڈورے ابھر آئے ۔پھر کچھ نشہ کی سی حالت طاری ہوئی ،یکا یک صوفی جی نے سر اُٹھایا اور مجھ سے کہنے لگے بھائی جان،میں نے کہا فرمایئے،کہنے لگے ''میں خدا ہوں'' اس پر میں نے زمین پر سے ایک تنکا اٹھایا اور اس کے دوٹکڑے کر کے صوفی جی کو دیتے ہوئے کہا،لیجئے میں تو ایک حقیر بندہ ہوں،یہ تنکا خدا نے پیدا کیا تھا میں نے اس کے دوٹکڑے کر دیئے ہیں،آپ خدا ہیں اس کو جوڑ دیجئے صوفی جی نے دونوں ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کو آپس میں ملا کر ان پر توجہ فرمائی لیکن کیا بنتا تھا ،ساتھ ہی ان کی وہ کیفیت بھی غائب ہوگئی جس کی وجہ سے وہ خدائی کا دعویٰ کر رہے تھے۔

ناظرین کو یاد رکھنا چاہئے کہ اس قسم کی کیفیتیں صرف اس وقت تک قائم رہتی ہیں جب تک انسان اسی طرح ساکت وصامت بیٹھا رہے جس حالت میں کیفیت شروع ہوتے وقت تھا اگر وہ ذرا ہلے جلے یا اپنی نظر کسی اور طرف پھیرے یا کسی وجہ سے خیال کہیں اور ہٹ جائے تو کیفیت بھی فوراً ختم ہوجاتی ہے۔یہی حال صوفی جی کا ہوا، تنکے کو جوڑنے کے لیے جو خیال بنا ،کیفیت ختم ہوگئی۔

اس پر صوفی جی کہنے لگے،پھر آخر یہ سب کچھ کیا ہے۔میں نے پوچھا کیا؟ بولے کہ یہی وحدت الوجود،میرے خیال میں تو یہ سب ایک کیفیت ہے،حقیقت نہیں ہے۔میں نے کہا اب آپ نے پتہ کی بات کہی،واقعی وحدت الوجود ایک بہت بڑی کیفیت ہے حقیقت نہیں ہے۔صوفی جی نے کہا تو کیا حضرت ابن عربیؒ جیسے عظیم الشان بزرگ نے بھی غلطی کی ہے۔ میں نے جواب دیا کہ حضرت ابن عربی نبی تو نہیں تھے ولی ہی تھے اور اولیاء سے غلطی کا ہوجانا کوئی تعجب کی بات نہیں لیکن میرے خیال میں حق یہ ہے کہ حضرت ابن عربیؒ نے غلطی نہیں کی

بلکہ ان کو غلط فہمی ہوئی جیسی کہ ابھی آپ کو اپنے بارے میں ہوگئی تھی۔فرق صرف اتنا ہے کہ آپ کی کیفیت صرف چند لمحوں کے لیے تھی اس لیے غلط فہمی بھی چند لمحے رہی۔لیکن حضرت ابن عربیؒ چونکہ اپنے سلوک کے اختتام پر آنکھوں سے مشاہدہ کرنے کے بعد اس غلط فہمی میں مبتلا ہوئے اس لیے ان کی غلط فہمی دور نہ ہوئی۔

اب تک ہم نے جو کچھ لکھا ہے اگر آپ نے غور سے پڑھا ہے تو آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ نعوذ باللہ ہم جناب محی الدین ابن عربیؒ کی علمیت یا روحانی بزرگی کے منکر نہیں ہیں۔ہم تو صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ سلوک کے اعلیٰ ترین مقامات پر پہنچنے کے بعد چونکہ سالک کو ایسی چیزیں مکشوف و مشہود ہوتی ہیں جن کی کوئی صورت و شکل نہیں ہوتی اور جن کی مثال بھی اس دنیا میں موجود نہیں ہے اس لیے کسی سالک کا غلط فہمی میں مبتلا ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں اور ظاہر ہے کہ غلط فہمی پر اللہ تعالیٰ مواخذہ نہ فرمائیگا۔ایسا ہی واقعہ خود ہمارے شیخ حضرت مولانا کریم الدین احمدؒ کے ساتھ بھی پیش آیا۔مولانا کو جس وقت روح کا مشاہدہ ہوا تو وہ غلطی سے اس کو ذات باری تعالیٰ سمجھے اور عرصہ دراز تک اسی کو سجدے کرتے رہے حتیٰ کہ ایک دفعہ جب وہ جنگل میں بہ کیفیت جذب پھر رہے تھے ایک فقیر ان کو ملا اور اس غلطی پر متنبہ کر کے اس بھنور سے نکال دیا۔خود ہمارے اپنے ساتھ بھی یہی ہوا کہ جب ہم ھو طے کر کے عدم میں پہنچے تو چونکہ وہاں نہ کچھ محسوس و مدرک ہوتا ہے، نہ دکھائی دیتا ہے اس لیے اس کو ذات بحت سمجھ لیا اور کافی عرصہ تک یہی غلط فہمی رہی یہاں تک کہ ایک مجذوب بزرگ نے اس غلطی سے آگاہ کیا اور عدم طے کرادیا۔ہم تو چیز ہی کیا ہیں بڑے بڑے بزرگوں نے معمولی معمولی کوائف میں ٹھوکریں کھائی ہیں۔حضرت منصور علیہ الرحمۃ کے ساتھ بھی یہی ہوا۔امر واقعہ یہ ہے کہ آج تک کسی بزرگ نے منصور علیہ الرحمۃ کے دعوے اَنَــــا اَلْــحَـــقِ کی تحقیق نہیں کی۔

ہمارے خیال میں حضرت منصورؒ کو بھی غلط فہمی ہوئی تھی ۔ توجیہہ اس کی یہ ہے ۔

یہ بات ہر صوفی اور متصوف اچھی طرح جانتا ہے کہ سلوک میں جذب کا پیدا ہونا ایک لازمی امر ہے ۔ جذب کے بغیر سلوک طے نہیں ہوسکتا ۔ وجہ یہ ہے کہ جذب میں ایسا سرور، کیف ونشہ اور سرخوشی وسرمستی ہوتی ہے جس کی لذت میں رنج وغم، تکلیف وصعوبت اور دنیوی علائق وتعلقات کی مزاحمت کا کوئی اثر سالک کے دل ودماغ پر نہیں ہونے پاتا اور وہ اطمینان وسکون کے ساتھ مراحل ومنازل سلوک طے کرتا چلا جاتا ہے ۔ لیکن سالک تین قسم کے ہوتے ہیں ، ایک وہ جن کا ظرف اتنا بڑا ہوتا ہے کہ خواہ کتنی ہی قوت جذب پیدا ہو ان کی طبیعت اور عقل پر غالب نہیں ہوسکتی ۔ دوسرے وہ لوگ کہ معمولی سا جذب بھی پیدا ہوجائے تو ان کی عقل وطبیعت مغلوب ہوجاتی ہے اور وہ سُکر میں مبتلا ہوجاتے ہیں، تیسرے وہ لوگ جو پہلی دو جماعتوں کے بین بین ہیں ۔

اُولوالعزم اور عالی ظرف حضرات کی پہلی جماعت مشتمل ہے خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کے صحابہ کبار اور بہت سے تابعین پر ۔ دوسری جماعت میں کچھ تابعین اور باقی تبع تابعین حضرات ہیں ۔ ان کے بعد جو لوگ ہیں وہ تیسری جماعت میں ہیں ۔ مگر ان میں بھی بعض بعض ایسے ہوتے ہیں جن پر جذب کا غلبہ بالکل نہیں ہوتا یا بہت معمولی ہوتا ہے ۔ ظاہر ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم میں قوت جذب جتنی زیادہ تھی اتنی نہ تو پہلے کسی میں تھی نہ بعد میں ہوگی مگر باوجود ازیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس جذب کا ظہور ساری عمر میں صرف ایک مرتبہ جنگ بدر میں اس موقع پر ہوا جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مٹھی بھر خاک دشمنوں کی طرف پھینکی، اس کے علاوہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کبھی کوئی بات ایسی ظہور میں نہیں آئی جس کو جذب کا اثر کہا جاسکے اور یہ کیفیت بھی چند سیکنڈ کے لیے اس طرح ظہور پذیر ہوئی کہ

نہ کسی نے دیکھا، نہ کوئی سمجھا۔حضرت عمرؓ سے صرف دو مرتبہ جذب کا ظہور ہوا۔ایک اس وقت جب کہ آپ نے مسجد نبوی میں بیٹھے بیٹھے یا ساریۃ الجبل (اے ساریہ پہاڑ کی طرف) کہا جب کہ ساریہ میدان یرموک میں جنگ کر رہے تھے۔دوسری مرتبہ اس وقت جب کہ آپ نے دریائے نیل کو خط لکھا۔حضرت علیؓ اکثر حالتِ جذب میں رہتے تھے لیکن آپ کو بھی سُکر کبھی نہیں ہوا۔

بتانا یہ مقصود ہے کہ حضرت حسین ابن منصور حلاج سے پہلے جذب کا غلبہ کبھی اس قدر شدت سے کسی پر نہیں ہوا جتنا کہ ان پر ہوا۔ جتنے بھی سالک ہیں اور ان کو جذب کا تجربہ ہوا ہے بخوبی جانتے ہیں کہ جس وقت جذب کی شدت ہوتی ہے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ بدن کے اندر کوئی دوسری روح یا طاقت حلول کر گئی ہے اور یہی وقت ہوتا ہے جب کہ سالک سے اضطراراً بے شمار کرامتیں سرزد ہوتی ہیں۔وہ جو کچھ کہہ دیتا ہے ہو جاتا ہے، جو خیال کرتا ہے ظہور میں آجاتا ہے۔یہی حضرت منصور کے ساتھ ہوا۔ان پر جس وقت جذب طاری ہوتا بے شمار لوگ ان کے گرد اکٹھے ہو جاتے اور کرامات طلب کرتے تھے۔حتیٰ کہ ان سے جنت کے میوے منگواتے اور وہ دونوں آستینوں کو جھاڑتے تو ان میں سے سیب، انار اور انگور وغیرہ جھڑنے لگتے اور لوگ مزے لے لے کر کھاتے لیکن جس وقت جذب کی کیفیت نہ ہوتی صحو ہوتا تو اس وقت کوئی کرامت بھی سرزد نہ ہوتی تھی۔اب چونکہ یہ ان کا پہلا تجربہ تھا اور متقدمین میں سے بھی کسی کی کوئی ایسی مثال موجود نہ تھی اس لیے لامحالہ قوتِ جذب کے متعلق ان کو یہ غلط فہمی ہو گئی کہ اس وقت خود خدا ان کے اندر گھس جاتا ہے اور وہی یہ کرامات دکھاتا ہے۔ یہیں سے انہوں نے حلول کا مسئلہ اخذ کر لیا جو سراسر کفر و زندقہ ہے۔یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ علمائے شریعت نے ان کے کفر اور قتل کا فتویٰ اس لیے نہیں دیا تھا کہ وہ جذب کے

وقت بے خودی یا سُکر میں انا الحق کہتے تھے بلکہ اس لیے دیا تھا کہ جب وہ ہوش میں آجاتے اور صحو کی حالت میں ہوتے اس وقت بھی وہ یہی کہتے تھے کہ خدا بندے کے جسم میں حلول کرسکتا ہے ورنہ سُکر میں تو اکثر لوگوں نے ایسے کلمات کہے ہیں، علمائے شریعت نے کسی کے خلاف بھی فتویٰ نہیں دیا۔ خود حضرت بایزید بسطامی نے کئی دفعہ سبحانی ما اعظم شانی کہا لیکن چونکہ یہ اعتراف کرلیا کہ ان کے منہ سے یہ کلمات بحالت سُکر نکلتے ہیں اس لیے کسی نے بھی گرفت نہیں کی الغرض اکثر سالکوں کو ایسی غلط فہمیاں ہوئی ہیں اور حضرت منصور کو بھی ایسی ہی غلط فہمی ہوئی۔

اب آپ خود ہی بتائیں کہ جب بڑے بڑے بزرگوں کو ایسی غلط فہمیاں ہوتی ہیں تو بے چارے عوام کالانعام کا تو ذکر ہی کیا، چنانچہ جب نظریہ وحدت الوجود کا ذکر خاصان خدا کے طبقہ سے نکل کر معمولی پیروں تک پہنچا اور انہوں نے اپنے جاہل مریدوں کے سامنے بڑے رازدارانہ انداز میں بیان کیا تو ہر طرف آگ سی لگ گئی۔ اکثر طبائع تو ویسے ہی بغاوت پر مائل شرعی اور اخلاقی پابندیوں سے گریزاں اور مادر پدر آزادی حاصل کرنے کے لیے بے چین ہوتی ہیں۔ ان کے کان میں جب یہ بھنک پڑی کہ "ارے ہم تو خدا ہیں" اور "باقی جو کچھ ہے یہ مولویوں نے ایسے ہی ڈھونگ رچا رکھا ہے" تو انہوں نے شرعی اور اخلاقی حدود و قیود کی زنجیریں توڑ کر پھینک دیں اور من مانی کرنے لگے خدا کا خوف، رسول کی محبت اور مذہب کا احترام دلوں سے اٹھ گیا کفر و الحاد کے زہریلے جراثیم معاشرے کے ایک بڑے طبقہ میں سرایت کر گئے۔

یہ باتیں پڑھ کر ممکن ہے کوئی کہے کہ یہ سب غلط ہے، ہم نے تو ایک آدمی بھی ایسا نہیں دیکھا جو اپنے آپ کو خدا سمجھتا ہو، نماز روزے سے منکر ہو اور حرام و حلال میں تمیز نہ کرتا ہو

تو معلوم ہونا چاہئے کہ یہ لوگ سب کے سامنے تو ایسی باتیں نہیں کرتے ۔ آپ ان کی خلوتوں میں ان کے ساتھ بیٹھیں اور ان کی باتیں سنیں تو آپ کو یقیناً ہماری تائید کرنی پڑے گی۔ اللہ کا شکر ہے کہ معاشرے کی اکثریت مسلمان ہے اور وجودیوں کی ان باتوں کو برداشت نہیں کرسکتی اس لیے ان کو عام مسلمانوں کے سامنے ایسی باتیں کرتے ہوئے ڈر لگتا ہے ورنہ ابھی تک ایک دو آدمی تو کیا تصوف کے ایسے خانوادے موجود ہیں جو مریدوں کو علی الاعلان یہی تعلیم دیتے ہیں کہ نماز روزے کی ضرورت نہیں تم خود خدا ہو، کھاؤ پیو اور عیش کرو۔ ناظرین میں سے اگر کسی کو کبھی کسی رسول شاہی پیر سے واسطہ پڑا ہو تو وہ یقیناً ہماری تائید کرے گا علاوہ ازیں مغربی پاکستان کے شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب تک سفر کر کے دیکھئے آپ کو اکثر دیہات اور قصبات میں ایسے لوگ ملیں گے جو بالکل برہنہ یا نیم برہنہ رہتے ہیں ، چنڈو یا چرس وغیرہ پیتے ہیں نماز روزے کے قریب بھی نہیں جاتے ۔ ان کے پاس سینکڑوں آدمی روزانہ منتیں اور مرادیں لے کر آتے ہیں اور اپنا دین وایمان لٹا کر واپس جاتے ہیں ان سینکڑوں آدمیوں میں سے دو چار کی منتیں پوری بھی ہو جاتی ہیں البتہ ایک بات ایسی ہے جو عوام کو ان کا معتقد بنا دیتی ہے اور وہ ہے ان میں سے بعض بعض کا کشف اور کرامات ۔تصوف میں کشف و کرامات کا کیا درجہ ہے اور کشف و کرامت کن کن لوگوں سے سرزد ہو سکتی ہے ۔ یہاں اس کی تفصیل بیان کرنے کی گنجائش نہیں ۔ یہاں تو صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ یہ لوگ جو بزرگ کہلاتے ہیں لیکن دین وایمان اور خدا اور رسول سے بے نیاز ہو کر زندگی گزارتے ہیں وجودی ہی تو ہیں ۔

مذہب اور سائنس

(مولانا وحید الدین خان)

مذہب اور سائنس دونوں بہت وسیع الفاظ ہیں۔ مذہب زندگی کا ایک تصور اور اس تصور پر بننے والے ایک ہمہ گیر طرز عمل کا نام ہے جو زندگی کے تمام پہلوؤں کے بارے میں اپنے کچھ مطالبات اور تقاضے رکھتا ہے۔ اور سائنس، اس محسوس دنیا کے مطالعہ کا نام ہے جو ہمارے مشاہدے اور تجربے میں آتی ہے یا آسکتی ہے۔ اس اعتبار سے دونوں نہایت وسیع موضوعات ہیں اور ان کے دائرے بہت سے پہلوؤں سے ایک دوسرے سے الگ الگ ہیں۔ مجھے یہاں دونوں کی تفصیلات پر کوئی بحث نہیں کرنی ہے۔ اس مقالہ کا موضوع صرف وہ فرضی یا حقیقی تصادم ہے جو سائنس اور مذہب کے درمیان علمی حیثیت سے واقع ہوا اور جس کے کچھ نتائج برآمد ہوئے۔ میں مختصر طور پر صرف اس دعویٰ سے بحث کرنا چاہتا ہوں جس میں دہرایا گیا ہے کہ سائنس کی دریافتوں نے مذہب کو بے بنیاد ثابت کر دیا ہے۔

سائنس اور مذہب کا روایتی ٹکراؤ خاص طور پر اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی پیداوار ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب کہ جدید سائنس کا ظہور ہوا۔ سائنسی دریافتوں کے سامنے آنے کے بعد بہت سے لوگ یہ سمجھنے لگے کہ اب خدا کو ماننے کی کوئی ضرورت نہیں۔ خدا کو ماننے کی ایک بہت بڑی وجہ دوسری وجہوں کے ساتھ یہ تھی کہ اس کو مانے بغیر کائنات کی توجیہ نہیں ملتی۔ مخالفین مذہب نے کہا کہ اب اس مقصد کے لئے ہم کو خدائی مفروضہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیوں کہ جدید سائنسی تحقیقات کی روشنی میں ہم آسانی کے ساتھ پوری کائنات کی اس طرح تشریح کر سکتے ہیں کہ کسی بھی مرحلے میں خدا کو ماننے کی کوئی ضرورت پیش

نہیں آئے گی۔ اس طرح خدا کا خیال ان کی نظر میں بے ضرورت چیز بن گیا۔ اور جو خیال بے ضرورت ہو جائے اس کا بے بنیاد ہونا لازمی ہے۔

یہ دعویٰ جب کیا گیا، اس وقت بھی اگر چہ وہ علمی حیثیت سے نہایت کمزور تھا، مگر اب تو خود سائنس نے براہ راست یا بالواسطہ طور پر اس بات کا اعتراف کر لیا ہے کہ اس کے پاس اس قسم کا دعویٰ کرنے کے لئے اطمینان بخش دلائل موجود نہیں ہیں۔

سائنس کی وہ کیا دریافت تھی جس میں لوگوں کو نظر آیا کہ اب خدا کی ضرورت ختم ہوگئی ہے۔ وہ خاص طور پر یہ تھا کہ سائنس نے معلوم کیا کہ کائنات کچھ خاص قوانین کی تابع ہے۔ قدیم زمانے کا انسان سادہ طور پر یہ سمجھتا تھا کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کا کرنے والا خدا ہے۔ مگر جدید ذرائع اور جدید طرز تحقیق کی روشنی میں دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ ہر واقعہ کے پیچھے ایک ایسا سبب موجود ہے جس کو تجربہ کر کے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ مثلاً نیوٹن کے مشاہدے میں نظر آیا کہ آسمان کے تمام ستارے اور سیارے کچھ ناقابل تغیر قوانین میں بندھے ہوئے ہیں اور انھیں کے تحت حرکت کرتے ہیں۔ ڈارون کی تحقیق نے اسے بتایا کہ انسان کسی خاص تخلیقی حکم کے تحت وجود میں نہیں آیا بلکہ ابتدائی زمانے کے کیڑے مکوڑے عام مادی قوانین کے تحت ترقی کرتے کرتے انسان بن گئے ہیں۔ اسی طرح مطالعہ اور تجربہ کے بعد زمین سے لے کر آسمان تک سارے واقعات ایک معلوم نظام کے تحت ظاہر ہوتے ہوئے نظر آئے جس کو قانون فطرت (law of nature) کا نام دیا گیا۔ قانون فطرت کا یہ عمل اس درجہ موثر تھا کہ اس کے بارے میں پیشگی خبر دی جا سکتی تھی۔

اس دریافت کا مطلب یہ تھا کہ جس کائنات کو ہم سمجھتے تھے کہ وہاں خدا کی کارفرمائی ہے، وہ کچھ مادی اور طبیعیاتی قوانین کی کارفرمائیوں کے تابع تھی۔ جب ان قوانین کو استعمال

کیا گیا اور اس کے کچھ نتائج بھی برآمد ہوئے تو انسان کا یقین اور زیادہ بڑھ گیا۔ جرمن فلسفی کانٹ نے کہا مجھے مادہ مہیا کرو اور میں تم کو بتا دوں گا کہ دنیا اس مادہ سے کس طرح بنائی جاتی ہے۔ ہیکل (Haeckel) نے دعویٰ کیا کہ ''پانی، کیمیاوی اجزا اور وقت ملے تو وہ ایک انسان کی تخلیق کرسکتا ہے۔'' نٹشے نے اعلان کردیا کہ ''اب خدا مرچکا ہے۔'' اس طرح یہ یقین کرلیا گیا کہ اس کائنات کا خالق اور مالک کوئی زندہ اور صاحب ذہن وارادہ ہستی نہیں ہے۔ بلکہ کائنات از اول تا آخر ایک مادی کائنات ہے۔ کائنات کی ساری حرکتیں اور اس کے تمام مظاہر خواہ وہ ذی روح اشیاء سے متعلق ہوں یا بے روح اشیاء کے بارے میں ہوں، اندھے مادی عمل کے سوا اور کچھ نہیں۔ سائنس نے جس دنیا کو دریافت کیا اس میں کہیں اس خدا کی کارفرمائی نظر نہیں آتی تھی جو تمام مذاہب کی بنیاد ہے۔ پھر خدا کو مانا جائے تو کس لئے مانا جائے۔

اگرچہ اس دریافت کے ابتدائی تمام ہیرو خدا کو ماننے والے لوگ تھے مگر دوسرے لوگوں کے سامنے جب یہ تحقیق آئی تو انھوں نے پایا کہ اس دریافت نے سرے سے خدا کے وجود ہی کو بے معنی ثابت کردیا ہے۔ کیونکہ واقعات کی توجیہ کے لئے جب خود مادی دنیا کے اندر اسباب وقوانین مل رہے ہوں تو پھر اس کے لئے مادی دنیا سے باہر ایک خدا کو فرض کرنے کی کیا ضرورت۔ انھوں نے کہا کہ جب دوربین نہیں بنی تھی اور ریاضیات نے ترقی نہیں کی تھی اس وقت انسان نہیں جان سکتا تھا کہ سورج کیسے نکلتا ہے اور کیسے ڈوبتا ہے۔ چنانچہ اپنی لاعلمی کی وجہ سے اس نے یہ فرض کرلیا کہ کوئی خدائی طاقت ہے جو ایسا کرتی ہے۔ مگر اب فلکیات کے مطالعہ سے ثابت ہوگیا ہے کہ جذب وکشش کا ایک عالمی نظام ہے جس کے تحت سورج، چاند اور تمام ستارے اور سیارے حرکت کررہے ہیں۔ اس لئے اب خدا کو ماننے کی کوئی

ضرورت نہیں۔ اس طرح وہ تمام چیزیں جن کے متعلق پہلے سمجھا جاتا تھا کہ ان کے پیچھے کوئی ان دیکھی طاقت کام کر رہی ہے، وہ سب جدید مطالعہ کے بعد ہماری جانی پہچانی فطری طاقتوں کے عمل اور ردِّعمل کا نتیجہ نظر آیا۔ گویا ایک خدا یا مافوق الفطری طاقت کا وجود بے بنیاد طور پر فرض کر لیا گیا تھا۔ اگر قوس قزح گرتی ہوئی بارش پر سورج کی شعاعوں کے انعطاف (refraction) سے پیدا ہوتی ہے تو یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ وہ آسمان کے اوپر خدا کا نشان ہے''۔ ہکسلے اس قسم کے واقعات پیش کرتا ہوا کس قدر یقین کے ساتھ کہتا ہے:

If events are due to natural causes, they are not due to supernatural causes.

یعنی واقعات اگر فطری اسباب کے تحت صادر ہوتے ہیں تو وہ مافوق الفطری اسباب کے پیدا کئے ہوئے نہیں ہو سکتے۔ اور ظاہر ہے کہ جب واقعات کے پیچھے مافوق الفطری اسباب موجود نہ ہوں تو کسی مافوق الفطرت ہستی کے وجود پر کیسے یقین کیا جا سکتا ہے۔

مخالفین مذہب کے اس استدلال میں کیا کمزوری ہے، اس کو ایک مثال سے سمجھئے۔ ایک شخص ریلوے انجن کو دیکھتا ہے کہ اس کے پہیے گھوم رہے ہیں اور وہ پٹری پر بھاگا چلا جا رہا ہے اس کے ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ پہیے کیسے گھوم رہے ہیں۔ تحقیق کرنے کے بعد اس کی رسائی انجن کے پرزوں تک ہوتی ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ پرزوں کی حرکت سے پہیے گھوم رہے ہیں۔ کیا اس دریافت کے بعد وہ یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوگا کہ انجن اپنے پرزوں کے ساتھ بذاتِ خود ٹرین کی حرکت کا سبب ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ انجن سے پہلے انجینئر اور ڈرائیور کو ماننا ضروری ہے۔ انجینئر اور ڈرائیور کے بغیر انجن کا نہ تو کوئی وجود ہے اور نہ اس میں کسی قسم کی حرکت کا تصور مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ گویا انجن یا اس کا پرزہ آخری حقیقت

نہیں۔آخری حقیقت وہ ذہن ہے جو انجن کو وجود میں لایا ہے اور اپنے ارادہ سے اس کو چلا رہا ہے۔ایک عیسائی عالم نے بہت صحیح کہا کہ فطرت کائنات کی توجیہ نہیں کرتی، وہ خود اپنے لئے ایک توجیہ کی طالب ہے:

Nature does not explain, she is herself in need of an explanation

کیونکہ اس کے الفاظ میں فطرت کا قانون تو کائنات کا ایک واقعہ ہے، اس کو کائنات کی توجیہ کہا جا سکتا ہے: Nature is a fact, not an explanation

مرغی کا بچہ انڈے کے مضبوط خول کے اندر پرورش پاتا ہے اور اس کے ٹوٹنے سے باہر آجاتا ہے۔یہ واقعہ کیونکر ہوتا ہے کہ خول ٹوٹے اور بچہ جو گوشت کے لوتھڑے سے زیادہ ہوتا، وہ باہر نکل آئے۔پہلے کا انسان اس کا جواب یہ دیتا تھا کہ ''خدا ایسا کرتا ہے مگر اب خوردبینی مشاہدہ کے بعد معلوم ہوا کہ جب ۲۱ روز کی مدت پوری ہونے والی ہوتی ہے، اس وقت انڈے کے اندر ننھے بچے کی چونچ پر ایک چھوٹی سی سخت سینگ ظاہر ہوتی ہے۔اس کی مدد سے وہ اپنے خول کو توڑ کر باہر آجاتا ہے۔سینگ اپنا کام پورا کر کے بچے کی پیدائش کے چند روز بعد خود بخود جھڑ جاتی ہے۔

مخالفین مذہب کے نظریے کے مطابق یہ مشاہدہ اس پرانے خیال کو غلط ثابت کر دیتا ہے کہ بچہ کو باہر نکالنے والا خدا ہے۔کیونکہ خوردبین کی آنکھ ہم کو صاف طور پر دکھا رہی ہے کہ ایک اکیس روزہ قانون ہے جس کے تحت وہ صورتیں پیدا ہوتی ہیں جو بچہ کو خول کے باہر لاتی ہیں۔مگر یہ مغالطہ کے سوا اور کچھ نہیں۔جدید مشاہدہ نے جو کچھ ہمیں بتایا ہے وہ صرف واقعہ کی چند مزید کڑیاں ہیں، اس نے واقعہ کا اصلی اور آخری سبب نہیں بتایا۔اس مشاہدہ کے

بعد صورت حال میں جو فرق ہوا ہے وہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ پہلے جو سوال خول ٹوٹنے کے بارے میں تھا، وہ "سینگ" کے اوپر جا کر ٹھہر گیا۔ بچہ کا اپنی سینگ سے خول کو توڑنا واقعہ کی صرف ایک درمیانی کڑی ہے۔ اس لحاظ سے وہ اصل واقعہ کا ایک جزو ہے، وہ واقعہ کی تشریح نہیں ہے۔ واقعہ کی تشریح تو اس وقت معلوم ہوگی جب ہم جان لیں کہ وہ آخری اسباب کیا ہیں جن کے نتیجہ میں بچہ کی چونچ پر سینگ نمودار ہوئی۔ اس آخری سبب کو جاننے سے پہلے سینگ کا ظہور خود ایک سوال ہے، نہ کہ اسے اصل سوال کا جواب قرار دیا جائے۔ کیونکہ پہلے اگر یہ سوال تھا کہ "خول کیسے ٹوٹتا ہے تو اب یہ سوال ہوگیا کہ "سینگ کیسے بنتی ہے۔ ظاہر ہے کہ دونوں حالتوں میں کوئی نوعی فرق نہیں۔ اس کو زیادہ سے زیادہ فطرت کا وسیع تر مشاہدہ کہہ سکتے ہیں۔ فطرت کی توجیہ کا نام نہیں دے سکتے۔ مخالفین مذہب جس انکشاف کو فطرت کی توجیہ کا نام دے کر اس کو خدا کا بدل ٹھہرا رہے ہیں، اس کو ہم نہایت آسانی سے فطرت کا طریق کار کہہ سکتے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ خدا ان قوانین کے ذریعہ کائنات میں اپنا عمل کرتا ہے جس کے بعض اجزا کو سائنس نے دریافت کیا ہے۔ فرض کیجئے مذہبی لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ سمندروں میں جوار بھاٹا لانے والا خدا ہے۔ اب جدید دور کا ایک سائنسدان ہم کو بتاتا ہے کہ جوار بھاٹا درحقیقت چاند کی کشش (gravity-pull of the moon) اور دنیا کے سمندروں اور خشکی کے ٹکڑوں کی جغرافی وضع و ہیت (Geographical Configuration) کے سبب سے ہوتا ہے۔ سائنس داں کے اس مشاہدہ کو ہمیں رد کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بہت خوشی کے ساتھ ہم اسے قبول کر سکتے ہیں۔ مگر اس سے ہمارے عقیدہ کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ یہ صحیح ہے کہ طوفان قوت کشش اور زمین کی جغرافی بناوٹ کے ذریعہ عمل کرتا ہے۔ مگر قوت کشش اور جغرافی بناوٹ کیا ہیں۔ وہ بھی خدا ہی کی

مخلوق ہیں۔ وہ خدا ہی ہے جو ان ذرائع سے اپنا فعل انجام دیتا ہے۔ خدا آج بھی طوفان کا حقیقی سبب ہے۔ جان ولسن کے الفاظ میں:

This does'nt destroy my belief: it is still God working through these things, who is responsible for the tides. John Wilson, Philosophy and Religion, (London, 1816) p37

اسی طرح حیاتیات کے میدان میں نظریہ ارتقاء کے حوالہ سے یہ بات بار بار دہرائی گئی ہے کہ حیاتیاتی عمل اب کسی ماورائے فطرت ذریعہ کی موجودگی کا تقاضا نہیں کرتا۔ دوسرے لفظوں میں زندگی کے مسئلہ کو سمجھنے کے لئے کسی باشعور خدا کو ماننے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ جدید مطالعہ یہ ثابت کرتا ہے کہ زندگی صرف چند مادی طاقتوں سے خود بخود ہونے والا ایک نتیجہ ہے جو خاص طور پر تین ہیں۔

reproduction, variation, and differential survival.

یعنی توالد وتناسل کے ذریعہ مزید زندگیوں کا پیدا ہونا، پیدا شدہ نسل کے بعض افراد میں کچھ فرقوں کا ظہور اور پھر ان فروق کا پشتہا پشت میں ترقی کر کے مکمل ہو جانا۔ اس طرح مخالفین مذہب کے نقطۂ نظر کے مطابق ڈارون کے انتخاب طبیعی کے اصول کا حیاتیاتی مظاہر پر انطباق اس کو ممکن اور ضروری بنا دیتا ہے کہ زندگی کی نشو نما پر خدا کی کارفرمائی کے تصور کو بالکل ترک کر دیا جائے۔

اگرچہ ابھی تک بذات خود یہ بات غیر ثابت شدہ ہے کہ انواع حیات فی الواقع اس طرح وجود میں آئی ہیں جیسا کہ ارتقاء پسند علماء بتاتے ہیں۔ تاہم اگر اس کو بلا بحث مان لیا

جائے جب بھی اس سے عقیدہ کے تزلزل کا سوال پیدا نہیں ہوتا کیونکہ انواع حیات اگر بالفرض ارتقائی عمل کے تحت وجود میں آئی ہوں جب بھی یکساں درجہ کی قوت کے ساتھ یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ یہ خدائی تخلیق طریقہ ہے، نہ کہ اندھے مادی عمل کا خود بخود نتیجہ۔ حقیقت یہ ہے کہ مشینی ارتقاء (mechanical evolution) کو نہایت آسانی کے ساتھ تخلیقی ارتقاء (creational evolution) ثابت کیا جاسکتا ہے۔ اور سائنس کے حوالہ سے مذہب کی مخالفت کرنے والوں کے پاس اس کی تردید کی کوئی واقعی بنیاد نہیں ہوگی۔

مگر بات صرف اتنی ہی نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سائنس نے بیسویں صدی میں پہنچ کر اپنے سابقہ یقین کو کھو دیا ہے۔ آج جب کہ نیوٹن کی جگہ آئن سٹائن نے لے لی ہے اور پلانک اور ہیزن برگ نے لاپلاس کے نظریات کو منسوخ کردیا ہے، اب مخالفین مذہب کے لئے، کم از کم علمی بنیاد پر اس قسم کا دعویٰ کرنے کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ نظریہ اضافیت (relativity) اور کوانٹم تھیوری نے خود سائنسدانوں کو اس نتیجہ تک پہنچایا ہے کہ وہ اس بات کا اعتراف کرلیں کہ یہ ناممکن ہے کہ سائنس میں مشاہد (observer) کو مشاہدہ (observed) سے الگ کیا جاسکے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم کسی چیز کے صرف چند خارجی مظاہر کو دیکھ سکتے ہیں، اس کی اصل حقیقت کا مشاہدہ نہیں کرسکتے۔ بیسویں صدی میں سائنس کے اندر جو انقلاب ہوا ہے اس نے خود سائنسی نقطۂ نظر سے مذہب کی اہمیت ثابت کردی ہے۔

سائنس میں جو چیز جدید انقلاب کہی جاتی ہے، وہ اس واقعہ پر مشتمل ہے کہ نیوٹن کا نظریہ جو دو سو سال تک سائنس کی دنیا پر حکمراں رہا، وہ جدید مطالعہ کے بعد ناقص پایا گیا ہے۔ اگرچہ سابقہ فکر کی جگہ ابھی تک کوئی مکمل نظریہ نہیں آسکا ہے مگر یہ واضح ہے کہ نئے رجحان کے

فلسفیانہ تقاضے اس سے بالکل مختلف ہیں جو پچھلے نظریے کے تھے۔ اب یہ دعویٰ نہیں رہا کہ سائنٹفک طریق مطالعہ ہی حقیقت کو معلوم کرنے کا واحد صحیح طریقہ ہے۔ سائنس کے ممتاز علماء حیرت انگیز طور پر اصرار کر رہے ہیں کہ

Science gives us but a partial knowledge of reality.

یعنی سائنس ہم کو صداقت کا صرف جزوی علم دیتی ہے۔

سائنسی رجحان میں یہ تبدیلی اچانک پیدا ہوئی ہے۔ صرف سو برس گزرے جب ٹنڈل (Tandall) نے اپنے خطبہ بلفاسٹ (Belfast address) میں اعلان کیا تھا کہ سائنس تنہا انسان کے تمام اہم معاملات سے بحث (deal) کرنے کے لئے کافی ہے۔ اس قسم کے خیالات اس مفروضہ یقین کی بنیاد پر قائم کئے گئے تھے کہ حقیقت تمام کی تمام صرف مادہ اور حرکت (matter and motion) پر مشتمل ہے۔ مگر فطرت کو مادہ اور حرکت کی اصطلاحوں میں بیان کرنے کی ساری کوشش ناکام ثابت ہوئی۔ اٹھارہویں صدی کے آخر میں یہ کوشش اپنے عروج پر تھی جب لاپلاس (Laplace) نے یہ کہنے کی جرات کی کہ ایک عظیم ریاضی داں جو ابتدائی اور سحابیہ (nebulae) میں ذرات کے انتشار کو جانتا ہو وہ دنیا کے مستقبل کی پوری تاریخ کو پیشگی بتا سکتا ہے۔ اس وقت یہ یقین کر لیا گیا تھا کہ نیوٹن کا نظریہ سارے علوم کی کنجی ہے۔

نیوٹن کے نظریہ کی غلطی پہلی بار اس وقت ظاہر ہوئی جب علما نے روشنی کی مادی تشریح کرنے کی کوشش کی۔ یہ کوشش انھیں ایتھر (ether) کے عقیدہ تک لے گئی جو بالکل مجہول اور ناقابل بیان عنصر تھا۔ کچھ نسلوں تک یہ عجیب وغریب عقیدہ چلتا رہا۔ روشنی کی مادی تعبیر کے حق میں ریاضیات کے خوب خوب معجزے دکھائے گئے۔ لیکن میکسویل

(Maxwell) کے تجربات کی اشاعت کے بعد یہ مشکل ناقابل عبور نظر آنے لگی۔ کیونکہ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ روشنی ایک برقی مقناطیسی مظہر (electromagnetic phenomenon) ہے۔ یہ خلا بڑھتا رہا یہاں تک کہ وہ دن آیا جب علماء سائنس پر واضح ہوا کہ نیوٹن کے نظریات میں کوئی چیز ''مقدس'' نہیں ہے۔ بہت دنوں کے تذبذب اور بجلی کو مادی (mechanical) ثابت کرنے کی آخری کوششوں کے بعد بالآخر بجلی کو ناقابل تحویل عناصر (irreducible elements) کی فہرست میں شامل کر دیا گیا۔

یہ بظاہر ایک سادہ سی بات ہے۔ مگر درحقیقت یہ بہت معنی خیز فیصلہ ہے۔ نیوٹن کے تصور میں ہم کو سب کچھ اچھی طرح معلوم تھا۔ اس کے مطابق ایک جسم کی کیت اس کی مقدار مادہ تھی طاقت کا مسئلہ حرکت سے سمجھ میں آجاتا تھا، وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح یقین کر لیا گیا تھا کہ ہم اس فطرت کو جانتے ہیں جس کے متعلق ہم کلام کر رہے ہیں۔ مگر بجلی کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ اس کی فطرت (nature) ایسی ہے جس کے متعلق ہم کچھ نہیں جان سکتے۔ اس کو معلوم اصطلاحوں میں تعبیر کرنے کی ساری کوششیں ناکام ہو گئیں۔ وہ سب کچھ جو ہم بجلی کے متعلق جانتے ہیں وہ صرف وہ طریقہ ہے جس سے وہ ہمارے پیمائشی آلات کو متاثر کرتی ہے اب ہم سمجھ سکتے ہیں کہ یہ بات کس قدر اہم ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک ایسے وجود (entity) کی طبعیات میں تسلیم کر لیا گیا جس کے متعلق ہم اس کے ریاضیاتی ڈھانچے کے سوا اور کچھ نہیں جانتے۔ اس کے بعد اس نہج پر اس قسم کے کچھ اور تجربے کئے گئے اور یہ مان لیا گیا کہ یہ لا معلوم ہستیاں بھی سائنسی نظریات کے بنانے میں وہی حصہ ادا کرتی ہیں جو قدیم معلوم مادہ ادا کرتا تھا۔ یہ حقیقت قرار پا گئی کہ جہاں تک علم طبعیات کا تعلق ہے،

ہم کسی چیز کے اصلی وجود کو نہیں جان سکتے۔ بلکہ صرف اس کے ریاضیاتی ڈھانچے (mathematical structure) کو جاننے کی کوشش کرسکتے ہیں۔اب اعلیٰ ترین سطح پر یہ تسلیم کرلیا گیا ہے کہ ہمارا یہ خیال کہ ہم اشیاء کو ان کی آخری صورت میں دیکھ سکتے ہیں محض فریب تھا۔پروفیسر اوگلشن(Eddington کےنزدیک ریاضیاتی ڈھانچہ کا علم ہی وہ واحد علم ہے جو طبیعیاتی سائنس ہمیں دے سکتی ہے۔

جمالیاتی، اخلاقی اور روحانی پہلوؤں سے قطع نظر، کیت مادہ، جوہر، وسعت اور مدت وغیرہ جو خالص طبیعیات کے دائرے کی چیزیں سمجھی جاتی ہیں، ان کی کیفیت کو جاننا بھی ہمارے لئے ایسا ہی مشکل ہوگیا ہے جیسے غیر مادی چیزوں کی حقیقت کو جاننا۔موجودہ طبیعیات اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ وہ ان چیزوں سے براہ راست واقف ہوسکے۔ ان کی حقیقت ادراک سے باہر ہے۔ہم ذہنی خاکوں کی مدد سے اندازہ کرسکتے ہیں مگر ذہن کا کوئی عکس ایک ایسی چیز کی بعینہ نقل نہیں ہوسکتا جو خود ذہن کے اندر موجود نہ ہو۔ اس طرح اپنے حقیقی طریق مطالعہ کے اعتبار سے طبیعیات ان خارج از ادراک خصوصیتوں کا مطالعہ نہیں کرتیں بلکہ وہ صرف مطالعہ بر آلہ(pointer reading) ہے جو ہمارے علم میں آتا ہے۔یہ صحیح ہے کہ یہ مطالعہ عمل کائنات کی بعض خصوصیات کو منعکس کرتا ہے، مگر ہماری اصل معلومات آلاتی مطالعہ سے متعلق ہیں نہ کہ وہ خصوصیات کے بارے میں ہیں۔آلاتی مطالعہ کو اشیاء کی حقیقی خصوصیات سے وہی نسبت ہے جو ٹیلی فون نمبر کو اس شخص سے جس کا وہ فون نمبر ہے‘‘

قرآن کا انسان

(اٹامک سائنٹسٹ سلطان بشیر محمود)

(ولقد کرمنا بنی آدم)

("Indeed we have honoured the progney of Adam")

تعارف: پچھلے ابواب میں ہم نے فلاسفروں سائنسدانوں اور مغربی تہذیب کے مقلدین کے انسان کے متعلق نظریات کا مختصر جائزہ لیا ہے۔ان سب کی تان یہیں ٹوٹتی ہے کہ انسان ایک ترقی یافتہ حیوان ہے یا ایک ارتقائی حادثہ۔ان کے مطابق اس کی پیدائش میں آگے پیچھے کوئی مقصد کارفرما نہیں ہے انسان کی زندگی میں اور نہ ہی اس کی موت میں کوئی راز ہے۔اس نظریہ میں کسی طرح کی مستقل اقدار کی کوئی گنجائش نہیں، ان کے نزدیک انسان خدا کی تخلیق نہیں حتیٰ کہ مذہب اور خود رب کائنات بھی انسانی ذہن کی پیداوار ہے۔یوں وہ سائنس کے نام پر انہی خیالات اور اوہام میں الجھے ہوئے ہیں جن میں ہزاروں سال قبل کے گمراہ لوگ تھے قرآن کریم سے ہمیں پتا چلتا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے کفار بھی یہی باتیں کرتے تھے اور ان کے بعد کوئی ساڑھے چار ہزار سال ہوئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی اسی قماش کے لوگوں سے پالا پڑا تھا۔جبکہ حقیقت یہ ہے کہ انسان حیوان نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی خصوصی تخلیق ہے، وہ کائنات سے نہیں بلکہ کائنات اس کی وجہ سے ہے،موت خاتمہ نہیں بلکہ زمان و مکان کے لیے سفر میں اس کی ایک منزل کا نام ہے۔

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے
جہاں ہے تیرے لیے تو نہیں جہاں کے لئے

انسان بزرگ ترین ہے:

اس گمراہ فلاسفی کے برعکس کہ انسان حیوانوں ہی میں سے ایک ترقی یافتہ حیوان ہے،قرآن کا انسان نہ صرف انتہائی محترم اور بزرگ ہستی ہے بلکہ وہ کائنات کی غرض وغایت بھی ہے، بحیثیت انسان اس کی بزرگی میں مذہب، ملت، رنگ، شکل وصورت غرض کسی طرح کی بھی اُونچ نیچ حائل نہیں۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ"**الخلق عیال اللہ**"یعنی خلقت اللہ تعالیٰ کا کنبہ ہے اور آدمی کے متعلق رب تعالیٰ کا اپنا ارشاد ہے:۔

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ آدَمَ

"بلاشک وشبہ ہم نے آدم کے بیٹے کو مکرم (محترم) بنایا ہے۔"

چنانچہ آدم علیہ السلام کی اولاد ہونے کی وجہ سے دنیاوی حیات میں بزرگی کا یہ شرف ہر مومن اور کافر کو یکساں حاصل ہے یہ عزت و افتخار ہر آدمی کا بنیادی حق (Human Right) ہے۔اسی لیے صوفیائے کرام کہتے ہیں:۔

مسجد ڈھادے،مندر ڈھادے، ڈھادے جو کچھ ڈھیندا

اک بندے دا دل نہ ڈھاویں، رب دلاں وچ رہندا

یعنی انسان کے دل کو ٹھیس لگانا مسجد کو تباہ کر دینے سے بڑا گناہ ہے۔حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:"مسلمان کی حرمت کعبۃ اللہ سے زیادہ ہے"۔ولقد کرمنا بنی آدم کا یہ بھی مطلب ہے کہ انسان کائنات سے عظیم تر ہستی ہے اور جیسے قرآن پاک میں ارشاد ہے کہ"**سَخَّرَ لَكُمْ مَا فِي السَّمٰوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ**"رب العالمین نے ہر چیز کو انسان کی خدمت پر لگا دیا ہے۔اس حقیقت کے پیش نظر کہ کائنات کی ہر چیز کا مقصد آدمی کی خدمت ہے تو آدمی پر بھی فرض ہو جاتا ہے۔وہ اپنے مقصدِ حیات کو

پہچانے، اپنے عظیم مقام سے گر کر کوئی عمل نہ کرے اور مخلوق کی بجائے صرف اپنے خالق کے سامنے جھکے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ:۔

وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومُ مُسَخَّرٰتٌ بِأَمْرِهِ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ۔(سورۃ النحل، آیت 12)

"اور اس نے تمہارے لئے رات اور دن کو مسخر کیا، اور سورج اور چاند اور ستارے اسی کے حکم سے تمہارے لئے مسخر ہیں بیشک اس میں نشانیاں ہیں عقلمندوں کے لئے"۔

انسان خالقِ کائنات کا مظہر ہے:

قرآنِ کریم کے انسان کا ایک عظیم امتیازی وصف اشیاء کا علم ہے۔ اللہ تبارک تعالیٰ خود علیم ہے اور اس نے انسان کو اپنے علم میں سے کچھ حصہ دے کر تمام دیگر مخلوقات میں عظیم بنا دیا ہے۔ اس کے متعلق قرآن پاک میں حضرت آدم علیہ السلام کا قصہ (Case History) ہر انسان کیلئے قابلِ فخر مثال ہے۔ قرآنِ کریم کی متعدد آیات (جن میں سے کئی ایک کے حوالے پہلے بھی دیئے جا چکے ہیں) سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو جنت میں اپنے ہاتھوں خصوصی طور پر پیدا کیا اور اس میں اپنی روح میں سے بھی کچھ پھونک دیا۔ یوں انسان کو اپنی صفاتِ عالیہ کا مظہر بنا دیا۔ انہی میں علم کی صفت بھی ہے۔ چنانچہ اس "**علیم الخبیر**" ذات پاک نے انسان پر اپنی تخلیقات کے راز افشاء کر دیئے۔ وہ کائنات کے سامنے ایک باعزت، ذی عقل، باعلم، خود مختار اور اشرف المخلوقات کی حیثیت سے لایا گیا۔ پھر ایک علمی مقابلہ کروایا گیا جس کے نتیجہ میں تمام جنات اور ملائکہ پر انسان کی علمیت کو ثابت کیا گیا۔ یعنی وہ سب علوم جن میں سے کچھ کو ہم سائنس کا نام دیتے ہیں اور ان کی مدد سے ہم آج کائنات کو سمجھنے کی کوشش کر رہے ہیں وہ دراصل بنی آدم کی فطرت کا

باطنی حصہ ہیں۔علم الاشیاء سے بھی عظیم تر تحفہ جو انسان کو نصیب ہوا وہ خود ذات پاک کا علم ہے جسے خالقِ کائنات کی معرفت کہتے ہیں۔ان کی روح سے "**الست بربکم**" کے سوال کے ساتھ رب تعالیٰ نے اپنی حقیقت کا اقرار کروایا اور اپنی معرفت سمجھائی۔افسوس کہ ہم میں سے اکثر اس روحانی علم کی روشنی حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔

ایک بے مثل ڈیزائن:

قرآنِ کریم انسان کے بارے میں یہ بھی بتاتا ہے کہ وہ اپنے روحانی اور جسمانی ڈیزائن میں اعلیٰ ترین خصوصی تخلیق ہے جس کا کوئی ثانی نہیں۔ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ:۔

وَالتِّينِ وَالزَّيْتُونِ ؛ وَطُورِ سِينِينَ؛ وَهَذَا الْبَلَدِ الْأَمِينِ؛ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ؛

"قسم ہے انجیر کی، زیتون کی اور طور سینین کی، اور اس امن والے شہر کی، یقیناً ہم نے انسان کو بہترین ڈیزائن، (احسن تقویم) کے مطابق خلق کیا، پھر اسے (امتحان کے لئے) کم سے کم تر درجہ پر (اسفل سافلین) دھکیل دیا۔(سورۃ التین، آیات 1-5)

"احسن تقویم" کا اشارہ انسان کی روحانی تخلیق کی طرف ہے اور اسفل سافلین اسکی حیوانی فطرت کی طرف ہے۔مطلب یہ کہ انسان اپنی فطرت میں روحانی ترقیوں کے آخری مقامات کا حامل ہے۔اس کا ڈیزائن اور ساخت کائنات کی تمام مخلوقات میں سے بہترین ہے۔یہ کہ "احسن تقویم" بنا کر "**اسفل سافلین**" کی طرف کیوں دھکیل دیا گیا، امتحانی غرض سے ہے تا کہ انسان خود بھی اپنی فضیلت کو ثابت کرے اور زمینی چیزوں کی حرص و ہوا سے بچ کر اپنی کھوئی ہوئی جنت والے عالی مقام کو حاصل کرے۔یہ قرآن کے انسان کے چند اعجازات ہیں۔لیکن افسوس کہ کچھ نام نہاد ترقی پسند اپنے آپ کو بندروں کی اولاد بتاتے ہیں

کاش کہ ہم اب بھی قرآنِ کریم کی رہنمائی میں اپنے مفروضوں سے نکل کر انسانی تخلیق کے کمالات کی طرف غور کرلیں۔ بندروں سے ہٹ کر اپنی سوچ کو رب کائنات کی عظمت اور شفقت کی طرف لوٹائیں۔

قرآن پاک میں انسانی تخلیق کی کہانی:

آیئے اب ہم قرآنِ کریم سے اپنی تخلیق کی باتیں سنیں۔ یہ کہانی ایک سبق آموز، نہایت حیران کن، قابلِ فخر بیان ہے جو انسان کو تاریکی کے پردوں سے نکال کر حقیقت کے نور کی طرف لے کر جاتی ہے۔ قرآنِ کریم میں کئی آیات مثلاً (21-11) 7، (116-123)20، (71-76)38، (28-31)15 میں اس عظیم واقعہ کی مختلف کیفیات بیان کی گئی ہیں۔ ان آیات کریمہ سے آدم علیہ السلام کی تخلیق کی جو حقیقت اُبھرتی ہے وہ حسب ذیل ہے۔

جس انداز میں قرآن کریم حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کی خبر دیتا ہے وہ بذاتِ خود بڑا چونکا دینے والا بیان ہے۔ فرمایا:۔

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَائِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً قَالُوا أَتَجْعَلُ فِيهَا مَنْ يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ قَالَ إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ

"اور (وہ وقت یاد کریں) جب آپ کے رب نے فرشتوں کو فرمایا کہ میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں، انہوں نے عرض کیا: کیا تو زمین میں کسی ایسے شخص کو (نائب) بنائے گا جو اس میں فساد انگیزی کرے گا اور وہ خونریزی کرے گا؟ حالانکہ ہم تیری حمد کے ساتھ تسبیح کرتے رہتے ہیں اور (ہمہ وقت) پاکیزگی بیان کرتے ہیں، (اللہ تعالیٰ نے) فرمایا:

میں وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے''(سورۃ البقرہ، آیت 30)

حضرت آدم علیہ السلام کے ظہور کے اس آفاقی اعلان سے پہلے فرشتے زمین پر بسنے والی مختلف مخلوقات کے اطوار سے آگاہ تھے۔ ان کے مشاہدہ میں حیوانات اور درندے آ چکے تھے جو آپس میں خون خرابا کرتے اور ایک دوسرے سے چھینا جھپٹی کرتے، اپنی خوراک کے حصول کے لئے ایک دوسرے کو جان سے مار دینے سے بھی دریغ نہ کرتے۔ بلکہ بعض تو ایک دوسرے کو کچا بھی کھا جاتے۔ انہی دو ٹانگوں پر چلنے والے کچھ ایسے بھی حیوان تھے جو اپنی سفاکی میں کوئی ثانی نہیں رکھتے تھے۔ وہ نہ صرف اپنے ہاتھوں اور دانتوں سے بلکہ پتھروں اور چھڑیوں سے بھی دوسروں کو مارتے، اکثر اوقات مخالف کا مارا جانا بلا ضرورت ہی ہوتا۔ اپنے ان مشاہدات کی بناء پر فرشتے غلط فہمی کے نتیجہ میں اس اعلان پر حیران ہوئے کہ کیا اللہ تعالیٰ انہی حیوانات میں سے کسی کو اپنا خلیفہ بنائے گا؟ اور حیرانی سے سوال کیا کہ:۔

''اے باری تعالیٰ! کیا آپ زمین میں اُسے نائب بنانیوالے ہیں جو وہاں خون خرابہ کرے گا اور اس کا امن درہم برہم کردے گا، جبکہ ہم آپ کی تعریف وتوصیف کرتے ہیں اور ہر وقت آپ کی تسبیح پڑھتے رہتے ہیں''۔(اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا) میں وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔''(سورۃ البقرہ، آیت 30)

جب حضرت آدم علیہ السلام کا جنتی وجود تیار ہو چکا، اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی روح میں سے کچھ پھونک کر اپنے اوصاف عطا کر دیئے تو فرمایا" اے آدم اب تو انہیں بتا کہ ان چیزوں کے خواص کیا ہیں؟ حضرت آدم علیہ السلام نے بلا تامل سب چیزوں کے صحیح صحیح نام بتا دیئے۔ حضرت آدم علیہ السلام کی اس امتحان میں کامیابی کے بعد رب ذوالجلال دوبارہ فرشتوں کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ کیا میں نے تمہیں نہیں بتایا تھا کہ میں زمین اور

آسمانوں کے تمام رازوں سے واقف ہوں اور مجھے تمہاری حیثیت اورفطرت کا بھی علم ہے اور جو تم ظاہر کرتے ہو یا چھپاتے ہو میں وہ سب کچھ جانتا ہوں"۔ جب حجت تمام ہوگئی تو رب العالمین نے فرشتوں کو حکم دیا"کہ اب تم آدم کی برتری کو تسلیم کرتے ہوئے اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جاؤ۔'' یہ حکم سن کر سب ہی سر بسجود ماسوائے ابلیس کے اس نے انکار کر دیا۔ شیطان کے اس رویہ پر اللہ تبارک تعالیٰ نے اس سے پوچھا کہ اے ابلیس تمہیں کس چیز نے آدم کے سامنے جھکنے سے باز رکھا تو وہ تکبر سے بولا! میں اس کے سامنے کیسے جھکوں جسے آپ نے مٹی کے خمیر سے اُٹھایا ہے۔ جبکہ میری تخلیق آگ سے کی گئی ہے جو مٹی سے برتر ہے اور اس طرح میں ایک کم تر تخلیق کے سامنے کیوں سر بسجود ہوں؟''

ابلیس کی اس جسارت اور تکبر کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کے مراتب چھین لیے اور اسے ذلیل وخوار کر کے راندہ درگاہ ہونے کا حکم دیا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ سے معافی مانگتا لیکن وہ تکبر اور حسد میں مزید بڑھتا چلا گیا اور آدم علیہ السلام اور اس کی اولاد کا دشمن بن گیا۔ اس کی سوچ یہ تھی کہ باری تعالیٰ کے حضور اس کی رسوائی کا باعث آدم اور ان کی اولاد ہے، اس لیے میں بھی اسے اللہ تعالیٰ کے حضور ذلیل کر کے چھوڑوں گا اور جس جنت سے مجھے اس کی وجہ سے نکلنا پڑا ہے میں بھی اسے وہاں سے نکال کر دم لوں گا۔ لیکن وہ آدم علیہ السلام پر زبردستی نہیں کر سکتا تھا چنانچہ اس نے انسان کو راہ حق سے گمراہ کرنے کی ٹھان لی۔ اس کے لیے اس کا حربہ انسان کے ذہن میں فاسد خیالات، شکوک وشبہات اور وسوسے ڈالنا ہے۔ لیکن اسکے پھندے میں وہی پھنستے ہیں جو خود بھٹکنا چاہتے ہیں، جو نیک راہ پر چلنا چاہتے ہیں شیطان ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے گا۔ ان کے لئے کوئی خوف یا غم نہ ہوگا، وہ انشاءاللہ اپنی کھوئی ہوئی جنت کو دوبارہ پالیں گے لیکن جو شیطان کی باتوں میں آ کر مقام انسانیت سے

نیچےگر جاتے ہیں وہ اس کے ساتھ جہنم کی آگ میں ڈال دیئے جائیں گے۔

یہ ہے قرآن کے انسان کی شاندار داستان بلند مقاصد کے لئے بلند مرتبہ تخلیق، اپنے ڈیزائن (تقویم) میں احسن ترین اور صلاحیتوں (Potential) میں بے مثل ہے؛ وہ کائنات میں رب تعالیٰ کا عارف اور اس کے خواص کا مظہر ہے اور زمین پر اس کا نائب ہے۔ اس کے ذمہ ان مقاصد کی تکمیل ہے جس کے لئے اسے پیدا کیا گیا۔

دنیاوی حیات کے دوران شیطان کا وجود انسان کے لئے بہت بڑا امتحان ہے۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی مشیت کا حصہ ہیں۔ انسان کی عزت اس میں ہے کہ وہ شیطان کا مقابلہ کر کے مالکِ کون ومکاں کی نظروں میں اپنا مقام بنائے۔ اللہ تعالیٰ چاہتا تو بلا امتحان بھی اسے سب کچھ دے سکتا تھا لیکن اس میں پھر انسان کا کیا کمال ہوتا۔ یہ تو ایسے ہی ہے جیسے کوئی کسی پتھر کو اٹھا کر اونچے مقام پر سجا دے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے انسان کو عزت علم اور اختیار کی نعمتوں سے بقیہ تمام مخلوقات پر امتیاز دیا اور اس کی خودی کی خاطر اسے موقع دیا کہ وہ ان اعزازات کا اپنے آپ کو حق دار ثابت کرے۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ شیطان کی تخلیق بھی ہوتی اور اسے انسان کو ورغلانے کی صلاحیت اور مہلت بھی عطا ہوتی۔

یہ تو انسان کی جنت میں کہانی کا پس منظر تھا، ادھر زمین پر طبق در طبق اس کے جسم کا ارتقا قوانین خداوندی کے تحت ایک مکمل منصوبہ کے ساتھ تکمیل پذیر ہو رہا تھا۔ جب جسمانی لحاظ سے بھی وہ اپنی معراج کو پہنچ گیا تو پھر ایک مناسب وقت پر اللہ تعالیٰ نے تمام بقیہ دو پاؤں پر چلنے والے انسان نما حیوانوں کو ختم کر دیا اور آدم کو اس کے زمینی جسم میں منتقل کر دیا اور زمین پر اللہ تعالیٰ کا نائب قرار دیا گیا۔ اس وقت سے قیامت تک جسم زمین پر ماؤں کے پیٹوں میں جنم لیں گے جب کہ ارواح عالمِ امر سے اپنی اپنی باری پر سے اتر کر ایک مقرر شدہ

اجل کے لئے اس میں رہنا شروع کر دیتی ہیں۔روح ہی اس کی اصل شخصیت ہے جس کا ارتقاء زمین پر کئے گئے اعمال کے مطابق ہوتا ہے اور پھر مقرر شدہ اجل کے بعد یہی روح جسم کی سواری چھوڑ کر عالمِ برزخ میں چلی جاتی ہے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ جسمانی لحاظ سے انسان کسی دوسرے سیارے سے گرائی گئی مخلوق نہیں ہے بلکہ ارضی زمین کا ہی ایک حصہ ہے البتہ اپنے روحانی مقام کے لحاظ سے اس کی ساخت، اہلیت اور فطرت اس احسن تقویم کے مطابق ہے جو جنت میں پیدا ہوا تھا اور مسجود خلائق ٹھہرا تھا۔اس ضمن میں قرآن کریم میں انسان بحیثیت جسم کے بارے میں ارشاد ہے کہ:۔

واللہ انبتکم من الارض نباتات ثم یعیدکم فیھا ویخرجکم اخراجا

اللہ تعالی نے تمہیں زمین سے پیدا کیا، مانند نباتات کے، پھر تمہیں زمین ہی میں لوٹائیں گے اور زمین میں سے ہی تم زندہ کئے جاؤ گے۔(سورۃ نوح، آیات 18-17)

غرضیکہ قرآن کریم سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اپنی روحانی حقیقت میں انسان کی تخلیق جنتی ہے جب کہ طبعیاتی دنیا میں اسکا جسم ارضی ہے۔یعنی آدم علیہ السلام کی ایک پیدائش جنتی ہے جس میں ان کا ڈیزائن تقویم، ماڈل جسم، روحانی فطرت، علم اور رب تعالیٰ کی صفات کا مظہر ہونے کی صلاحیت بھی شامل ہیں، ان سب کی جسمانی لحاظ سے دوسری پیدائش ارضی ہے تو جو مٹی کا پیراہن ہے جس کی بنیاد مادی عناصر ہیں اور جو زمینی اجزاء سے نشو ونما حاصل کرتا رہتا ہے اور اس کا رجحان بھی انہی چیزوں کی طرف ہے جو زمینی ہیں۔آخر کار جب انسان کی زمین پر لکھی گئی تقدیر پوری ہو جاتی ہے تو وہ اپنے جسم کا ایک ایک ذرہ زمین کو واپس کر دیتا ہے اور خود اپنے روحانی پیراہن میں منتقل ہو کر اگلے مقامات کی طرف سفر کا آغاز کرتا ہے۔

عقیدہ آخرت آثار و شواہد

(ابو محمد مخدوم زادہ)

اگر چہ آخرت پر دلالت کرنے والے آثار و شواہد کثرت سے موجود ہیں اور اس سے غفلت کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے، لیکن یہ لوگ اس سے خود ہی غفلت برت رہے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ ان کی اپنی کوتاہی ہے کہ دنیوی زندگی کے اس ظاہری پردے پر نگاہ جما کر بیٹھ گئے ہیں اور اس کے پیچھے جو کچھ آنے والا ہے اس سے بالکل بے خبر ہیں، اور خدا کی طرف سے ان کو خبردار کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں ہوئی ہے۔

یہ آخرت پر بجائے خود ایک مستقل استدلال ہے اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر یہ لوگ باہر کسی طرف نگاہ دوڑانے سے پہلے خود اپنے وجود پر غور کرتے تو انہیں اپنے اندر ہی وہ دلائل مل جاتے جو موجودہ زندگی کے بعد دوسری زندگی کی ضرورت ثابت کرتے ہیں، انسان کی تین امتیازی خصوصیات ایسی ہیں جو اس کی زمین کو دوسری موجودات سے ممیز کرتی ہیں۔

ایک یہ کہ زمین اور اس کے ماحول کی بے شمار چیزیں اس کے لئے مسخر کر دی گئی ہیں اور ان پر تصرف کے وسیع اختیارات اس کو بخش دیے گئے ہیں۔

دوسرے یہ کہ اسے اپنی راہ زندگی کے انتخابات میں آزاد چھوڑ دیا گیا ہے۔ ایمان اور کفر، اطاعت اور معصیت، نیکی اور بدی کی راہوں میں سے جس راہ پر بھی جانا چاہے جا سکتا ہے۔ حق اور باطل صحیح اور غلط جس طریقے کو بھی اختیار کرنا چاہے کر سکتا ہے، ہر راستے پر چلنے کے لئے اسے توفیق دے دی جاتی ہے اور اس پر چلنے میں وہ خدا کے فراہم کردہ ذرائع استعمال کر سکتا ہے، خواہ وہ خدا کی اطاعت کا راستہ ہو یا اس کی نافرمانی کا راستہ۔

تیسرے یہ کہ اس میں پیدائشی طور پر اخلاق کی حس رکھ دی گئی ہے جس کی بناء پر وہ اختیاری اعمال اور غیر اختیاری اعمال میں فرق کرتا ہے، اختیاری اعمال پر نیکی اور بدی کا حکم لگاتا ہے اور بدلیہۃً یہ رائے قائم کرتا ہے کہ اچھا عمل جزا کا اور برا عمل سزا کا مستحق ہونا چاہیے۔

یہ تینوں خصوصیتیں جو انسان کے اپنے وجود میں پائی جاتی ہیں اس بات کی نشان دہی کرتی ہیں کہ کوئی وقت ایسا ہونا چاہیے جب انسان سے محاسبہ کیا جائے۔ جب اس سے پوچھا جائے کہ جو کچھ دنیا میں اس کو دیا گیا تھا، اس پر تصرف کے اختیارات کو اس نے کس طرح استعمال کیا؟ جب یہ دیکھا جائے کہ اس نے اپنی آزادی انتخاب کو استعمال کر کے صحیح راستہ اختیار کیا یا غلط؟ جب اس کے اختیاری اعمال کی جانچ کی جائے اور نیک عمل پر جزا اور برے عمل پر سزا دی جائے۔ یہ وقت لامحالہ انسان کا کارنامہ زندگی ختم اور اس کا دفتر عمل بند ہونے کے بعد ہی آسکتا ہے نہ کہ اس سے پہلے اور یہ وقت لازماً اسی وقت آنا چاہیے جب کہ ایک فرد یا ایک قوم کا نہیں بلکہ تمام انسانوں کا دفتر عمل بند ہو۔ کیونکہ ایک فرد یا ایک قوم کے مر جانے پر ان اثرات کا سلسلہ ختم نہیں ہو جاتا جو اس نے اپنے اعمال کی بدولت دنیا میں چھوڑے ہیں، اس کے چھوڑے ہوئے اچھے یا برے اثرات بھی تو اس کے حساب میں شمار ہونے چاہئیں۔ یہ اثرات جب تک مکمل طور پر ظاہر نہ ہولیں انصاف کے مطابق پورا محاسبہ کرنا اور پوری جزا یا سزا دینا کیسے ممکن ہے؟ اس طرح انسان کا اپنا وجود اس بات کی شہادت دیتا ہے اور زمین میں انسان کو جو حیثیت حاصل ہے وہ آپ سے آپ اس امر کا تقاضا کرتی ہے کہ دنیا کی موجودگی کے بعد ایک دوسری زندگی ایسی ہو جس میں عدالت قائم ہو، انصاف کے ساتھ انسان کے کارنامہ زندگی کا محاسبہ کیا جائے اور ہر شخص کو اس کے کام کے لحاظ سے جزا دی جائے۔

دومزید دلیلیں:۔

اس فقرے میں آخرت کی دومزید دلیلیں دی گئی ہیں اس میں بتایا گیا ہے کہ اگر انسان اپنے وجود سے باہر کے نظام کائنات کونظرغور دیکھے تو اسے دوحقیقتیں نمایاں نظرآئیں گی۔

ایک یہ کہ کائنات برحق بنائی گئی ہے، یہ کسی بچے کا کھیل نہیں ہے کہ محض دل بہلانے کے لئے اس نے ایک بے ڈھنگا سا گھروندا بنالیا ہوجس کی تعمیر اورتخریب دونوں ہی بے معنی ہوں۔بلکہ یہ ایک سنجیدہ نظام ہے جس کا ایک ایک ذرہ اس بات پر گواہی دے رہا ہے کہ اسے کمال درجہ حکمت کے ساتھ بنایا گیا ہے جس کی ہر چیز میں ایک قانون کارفرما ہے،جس کی ہر شے بامقصد ہے۔انسان کا سارا تمدن اور اس کی پوری معیشت اور اس کے تمام علوم و فنون خود اس بات پر گواہ ہیں دنیا کی ہر چیز کے پیچھے کام کرنے والے قوانین کودریافت کرکے اورہر شے جس مقصد کے لئے بنائی گئی ہے اسے تلاش کرکے ہی انسان یہاں یہ سب کچھ تعمیر کرسکا ہے۔ورنہ ایک بے ضابطہ اور بےمقصد کھلونے ہیں اگر ایک پتلے کی حیثیت سے اس کو رکھ دیا گیا ہوتا توکسی سائنس اور کسی تہذیب وتمدن کا تصور تک نہ کیا جاسکتا تھا۔اب آخر یہ بات تمہاری عقل میں کیسے سماتی ہے کہ جس حکیم نے اس حکمت اور مقصدیت کے ساتھ یہ دنیا بنائی ہے اور اس کے اندرتم جیسی ایک مخلوق کو اعلی درجہ کی ذہنی وجسمانی طاقتیں دے کر، اختیارات دے کر، آزادی انتخاب دے کر، اخلاق کی حس دے کر اپنی دنیا کا بے شمار سروسامان تمہارے حوالہ کیا ہے، اس نے تمہیں بےمقصد ہی پیدا کردیا ہوگا؟تم دنیا میں تعمیر و تخریب اور نیکی وبدی،ظلم وعدل اورراستی وناراستی کے سارے ہنگامے برپا کرنے کے بعد بس یونہی مرکرمٹی میں مل جاؤ گے اور تمہارے کسی اچھے یا برے کام کا کوئی نتیجہ نہ ہوگا؟

تم اپنے ایک ایک عمل سے اپنی اور اپنے جیسے ہزاروں انسانوں کی زندگی پر اور دنیا کی بے شمار اشیاء پر بہت سے مفید مضر اثرات ڈال کر چلے جاؤ گے اور تمہارے مرتے ہی یہ سارا دفتر عمل بس یونہی لپیٹ کر دریا برد کر دیا جائے گا؟

دوسری حقیقت جو اس کائنات کے نظام کا مطالعہ کرنے سے صاف نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ یہاں کسی چیز کے لئے بھی ہمیشگی نہیں ہے۔ ہر چیز کے لئے ایک عمر مقرر ہے جسے پہنچنے کے بعد وہ ختم ہو جاتی ہے اور یہی معاملہ بحیثیت مجموعی پوری کائنات کا بھی ہے۔ یہاں جتنی طاقتیں کام کر رہی ہیں وہ سب محدود ہیں ایک وقت تک ہی وہ کام کر رہی ہیں اور کسی وقت پر انہیں لامحالہ خرچ ہو جانا اور اس نظام کو ختم ہو جانا ہے۔ قدیم زمانے میں تو علم کی کمی کے باعث ان فلسفیوں اور سائنسدانوں کی بات کچھ چل بھی جاتی تھی جو دنیا کو ازلی ابدی قرار دیتے تھے۔ مگر موجودہ سائنس نے علم کے حدوث وقدم کی اس بحث میں جو ایک مدت دراز سے دہریوں اور خدا پرستوں کے درمیان چلی آ رہی تھی، قریب قریب حتمی طور پر اپنا ووٹ خدا پرستوں کے حق میں ڈال دیا ہے، اب دہریوں کے لئے عقل اور حکمت کا نام لے کر یہ دعوی کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی ہے کہ دنیا ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی اور قیامت کبھی نہ آئے گی، پرانی مادہ پرستی کا سارا انحصار اس تخیل پر تھا کہ مادہ فنا نہیں ہو سکتا، صرف صورت بدلی جا سکتی ہے، مگر ہر تغیر کے بعد وہ مادہ ہی رہتا ہے اور اس کی مقدار میں کوئی کمی وبیشی نہیں ہوتی، اس بناء پر یہ نتیجہ نکالا جاتا تھا کہ اس عالم مادی کی نہ کوئی ابتداء ہے اور نہ کوئی انتہا، لیکن اب جوہری توانائی Atomic Energy کے انکشاف نے اس پورے تخیل کی بساط الٹ کر رکھ دی ہے اب یہ بات کھل گئی ہے کہ قوت مادے میں تبدیل ہوتی ہے اور مادہ پھر قوت میں تبدیل ہو جاتا ہے حتی کہ نہ صورت باقی رہتی ہے نہ ہیولی۔ اب حرکیات حرارت کے دوسرے قانون

Second Law of Thermo-Dynamics نے یہ ثابت کر دیا کہ یہ عالم مادی نہ ازلی ہو سکتا ہے نہ ابدی، اس کو لازماً ایک وقت شروع اور ایک وقت ختم ہونا ہی چاہیے، اس لئے سائنس کی بنیاد پر اب قیامت کا انکار ممکن نہیں رہا ہے، اور ظاہر بات ہے کہ جب سائنس ہتھیار ڈال دے تو فلسفہ کن ٹانگوں پر اٹھ کر قیامت کا انکار کریگا؟۔

آخرت کے حق میں تاریخی استدلال:۔

یعنی اس بات کے منکر کہ انہیں مرنے کے بعد اپنے رب کے سامنے حاضر ہونا ہے۔ یہ آخرت کے حق میں تاریخی استدلال ہے، مطلب یہ ہے کہ آخرت کا انکار دنیا میں دو چار آدمیوں ہی نے تو نہیں کیا ہے، انسانی تاریخ کے دوران میں کثیر التعداد انسان اس مرض میں مبتلا ہوتے رہے ہیں، بلکہ پوری پوری قومیں ایسی گزری ہیں جنہوں نے یا تو اس کا انکار کیا ہے، یا اس سے غافل ہو کر رہی ہیں، یا حیات بعد الموت کے متعلق ایسے غلط عقیدے ایجاد کر لئے ہیں جن سے آخرت کا عقیدہ بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے۔ پھر تاریخ کا مسلسل تجربہ یہ بتاتا ہے کہ انکار آخرت جس صورت میں بھی کیا گیا ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کے اخلاق بگڑے، وہ اپنے آپ کو غیر ذمہ دار سمجھ کر شتر بے مہار بن گئے، انہوں نے ظلم وفساد اور فسق وفجور کی حد کر دی اور اسی چیز کی بدولت قوموں پر قومیں تباہ ہوتی چلی گئیں۔ کیا ہزاروں سال کی تاریخ کا یہ تجربہ جو پے در پے انسانی نسلوں کو پیش آتا رہا ہے، یہ ثابت نہیں کرتا کہ آخرت ایک حقیقت ہے جس کا انکار انسان کے لئے تباہ کن ہے؟ انسان کشش ثقل کا اسی لئے تو قائل ہوا ہے کہ تجربے اور مشاہدے سے اس نے مادی اشیاء کو ہمیشہ زمین کی طرف گرتے ہوئے دیکھا ہے، انسان نے زہر کو زہر ہی اسی لئے تو مانا ہے کہ جس نے بھی زہر کھایا، وہ ہلاک ہوا، اسی طرح جب آخرت کا انکار ہمیشہ انسان کے لئے اخلاقی بگاڑ کا موجب ثابت

ہوا ہے تو کیا یہ تجربہ یہ سبق دینے کے لئے کافی نہیں ہے کہ آخرت ایک حقیقت ہے اور اس کو نظر انداز کر کے دنیا میں زندگی بسر کرنا غلط ہے؟

اصل میں لفظ "اثاروالارض" استعمال ہوا ہے اس کا اطلاق زراعت کے لئے ہل چلانے پر بھی ہوسکتا ہے اور زمین کھود کر زیر زمین پانی، نہریں، کاریزیں اور معدنیات وغیرہ نکالنے پر بھی۔

اس میں ان لوگوں کے استدلال کا جواب موجود ہے جس نے مادی ترقی کو کسی قوم کے صالح ہونے کی علامت سمجھتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ جن لوگوں نے زمین کے ذرائع کو اتنے بڑے پیمانے پر استعمال Exploit کیا ہے، جنہوں نے دنیا میں عظیم الشان تعمیری کام کیے ہیں اور ایک شاندار تمدن کو جنم دیا ہے، بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو جہنم کا ایندھن بنا دے، قرآن اس کا جواب یہ دیتا ہے کہ یہ تعمیری کام پہلے بھی بہت سی قوموں نے بڑے پیمانے پر کیے ہیں، پھر کیا تمہاری آنکھوں نے نہیں دیکھا کہ وہ قومیں اپنی تہذیب اور تمدن سمیت پیوند خاک ہو گئیں، اور ان کی تعمیر کا قصر فلک بوس زمین پر آ رہا؟۔

جس خدا کے قانون نے یہاں عقیدہ حق اور اخلاق صالحہ کے بغیر محض مادی تعمیر کی یہ قدر کی ہے، آخر کیا وجہ ہے کہ اسی خدا کا قانون دوسرے جہان میں انہیں واصل جہنم نہ کرے؟ (تفہیم القرآن ج ۳ ص ۷۳۴، ۷۳۵)

ایک غیر ذمہ دارانہ رویہ:۔

یہ لوگ جو ان شدید گمراہیوں میں پڑے ہوئے تھے اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ غور وفکر کرنے کے بعد یہ کسی دلیل و برہان سے اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ خدائی ہیں، درحقیقت کچھ

دوسری ہستیاں، اللہ تعالیٰ کی شریک ہیں، بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ انہوں نے کبھی سنجیدہ کے ساتھ غور وفکر ہی نہیں کی ہے، چونکہ یہ لوگ آخرت سے بے خبر ہیں، یا اس کی طرف سے شک میں ہیں یا اس سے اندھے بنے ہوئے ہیں اس لئے فکر عقبیٰ سے بے نیازی نے ان کے اندر سر اسر ایک غیر ذمہ دارانہ رویہ پیدا کر دیا ہے۔ یہ کائنات اور خود اپنی زندگی کے حقیقی مسائل کے بارے میں سرے سے کوئی سنجیدگی رکھتے ہی نہیں، ان کو اس کی پرواہ ہی نہیں ہے کہ حقیقت کیا ہے اور ان کا فلسفہ حیات اس حقیقت سے مطابقت رکھتا ہے یا نہیں۔ کیونکہ ان کے نزدیک آخر کار مشرک اور دہریے اور موحد اور مشکک سب کو مر کر مٹی ہو جانا ہے اور کسی چیز کا بھی کوئی نتیجہ نکلنا نہیں ہے۔

آخرت کا یہ مضمون اس سے پہلے کی آیت کے اس فقرے سے نکلا ہے کہ وہ نہیں جانتے کہ کب وہ اٹھائے جائیں گے، اس فقرے میں تو یہ بتایا گیا تھا کہ جن کو معبود بنایا جاتا ہے، اور ان میں فرشتے، جن، انبیاء اور اولیاء سب شامل تھے، ان میں سے کوئی بھی آخرت کے وقت سے واقف نہیں ہے کہ وہ کب آئے گی، اس کے بعد اب عام مشرکین و کفار کے بارے میں تین باتیں ارشاد ہوئی ہیں، اول یہ کہ وہ سرے سے یہی نہیں جانتے کہ آخرت کبھی ہوگی بھی یا نہیں، دوسرے یہ کہ ان کی یہ بے خبری اس بناء پر نہیں ہے کہ انہیں اس کی اطلاع ہی کبھی نہ دی گئی ہو، بلکہ اس بناء پر ہے کہ جو خبر انہیں دی گئی اس پر انہوں نے یقین نہیں کیا بلکہ اس کی صحت میں شک کرنے لگے، تیسرے یہ کہ انہوں نے کبھی غور وخوض کر کے ان دلائل کو جانچنے کی زحمت ہی نہیں اٹھائی جو آخرت کے وقوع کے بارے میں پیش کئے گئے بلکہ اس کی طرف سے اندھے بن کر رہنے ہی کو انہوں نے ترجیح دی۔

اس مختصر سے فقرے میں آخرت کی دو زبردست دلیلیں بھی ہیں اور نصیحت بھی۔

آخرت کی دو زبردست دلیلیں:۔

پہلی دلیل یہ ہے کہ دنیا کی جن قوموں نے بھی آخرت کو نظر انداز کیا ہے وہ مجرم بنے بغیر نہیں رہ سکی ہیں، وہ غیر ذمہ دار بن کر رہیں، انہوں نے ظلم وستم ڈھائے، وہ فسق و فجور میں غرق ہوگئیں، اور اخلاق کی تباہی نے آخر کار ان کو برباد کر کے چھوڑا، یہ تاریخ انسانی کا مسلسل تجربہ، جس پر زمین میں ہر طرف تباہ شدہ قوموں کے آثار شہادت دے رہے ہیں، صاف ظاہر کرتا ہے کہ آخرت کے ماننے اور نہ ماننے کا نہایت گہرا تعلق انسانی رویے کی صحت اور عدم صحت سے ہے۔ اس کو مانا جائے تو رویہ درست رہتا ہے۔ نہ مانا جائے تو رویہ غلط ہوجاتا ہے، یہ اس امر کی صریح دلیل ہے کہ اس کا ماننا حقیقت کے مطابق ہے، اسی لئے اس کے ماننے سے انسانی زندگی ٹھیک ڈگر پر چلتی ہے اور اس کا نہ ماننا حقیقت کے خلاف ہے، اسی وجہ سے یہ گاڑی پٹری سے اتر جاتی ہے۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ تاریخ کے اس طویل تجربے میں مجرم بن جانے والی قوموں کا مسلسل تباہ ہونا اس حقیقت پر صاف دلالت کر رہا ہے کہ یہ کائنات بے شعور طاقتوں کی اندھی فرمانروائی نہیں ہے بلکہ یہ ایک حکیمانہ نظام ہے جس کے اندر ایک اٹل قانون مکافات کام کر رہا ہے۔ جس کی حکومت انسانی قوموں کے ساتھ سراسر اخلاقی بنیادوں پر معاملہ کر رہی ہے، جس میں کسی قوم کو بدکرداریوں کی کھلی چھوٹ نہیں دی جاتی کہ ایک دفعہ عروج پا جانے کے بعد وہ ابدلآباد تک داد عیش دیتی رہے اور ظلم وستم کے ڈنکے بجائے چلی جائے، اس حقیقت کو جو شخص سمجھے وہ کبھی اس امر میں شک نہیں کر سکتا کہ یہی قانون مکافات اس دنیوی

زندگی کے بعد ایک دوسرے عالم کا تقاضا کرتا ہے جہاں افراد کا اور قوموں کا اور بحیثیت مجموعی پوری نوع انسانی کا انصاف چکایا جائے، کیونکہ محض ایک ظالم قوم کے تباہ ہو جانے سے تو انصاف کے سارے تقاضے پورے نہیں ہو گئے، اس سے ان مظلوموں کی تو کوئی دادرسی نہیں ہوئی جن کی لاشوں پر انہوں نے اپنی عظمت کا قصر بنایا تھا، اس سے ان ظالموں کو تو کوئی سزا نہیں ملی جو تباہی کے آنے سے پہلے مزے اڑا کر جا چکے تھے۔ اس سے ان بدکاروں پر بھی کوئی مواخذہ نہیں ہوا جو پشت در پشت اپنے بعد آنے والی نسلوں کے لئے گمراہیوں اور بد اخلاقیوں کی میراث چھوڑتے چلے گئے تھے، دنیا میں عذاب بھیج کر تو صرف انکی آخری نسل کے مزید ظلم کا سلسلہ توڑ دیا گیا، ابھی عدالت کا اصل کام تو ہوا ہی نہیں کہ ہر ظالم کو اس کے کیے کا بدلہ دیا جائے اور ہر مظلوم کے نقصان کی تلافی کی جائے۔ اور ان سب لوگوں کو انعام دیا جائے جو بدی کے اس طوفان میں راستی پر قائم اور اصلاح کے لئے کوشاں رہے، اور عمر بھر اس راہ میں اذیتیں سہتے رہے، یہ سب لازماً کسی وقت ہونا چاہیے کیونکہ دنیا میں قانون مکافات کی مسلسل کارفرمائی کائنات کی فرمانروا حکومت کا یہ مزاج اور طریقہ کار صاف بتا رہا ہے کہ وہ انسانی اعمال کو ان کی اخلاقی قدر کے لحاظ سے تولتی اور ان کی جزا و سزا دیتی ہے۔

ان دو دلیلوں کے ساتھ اس آیت میں نصیحت کا پہلو یہ ہے کہ پہلے مجرموں کا انجام دیکھ کر اس سے سبق لو اور انکار آخرت کے اسی احمقانہ عقیدے پر اصرار نہ کئے چلے جاؤ جس نے انہیں مجرم بنا کر چھوڑا تھا۔ (تفہیم القرآن ج ۳ ص ۱۰۲)

اسلامی تصوف میں عجمی آمیزش

(رائٹر پروفیسر یوسف سلیم چشتی)

اسلامی تصوف کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں صوفی کو سب سے پہلے یہ تلقین کی جاتی ہے کہ:

ا۔ اللہ کے سوا کسی شخص میں خواہ وہ نبی ہو یا رسول، غوث ہو یا قطب، کوئی قدرت نہیں ہے۔

ب۔ غیر اللہ سے استمد اد در کنار، اس کی طرف متوجہ ہونا بھی سالک کے لئے مضر ہے۔ ہر وقت اللہ کی طرف متوجہ رہنا چاہیے اسی کو تبتل کہتے ہیں۔

ج۔ **ماشاء اللہ لاقُوَّۃَ اِلَّا باللہ** ۔جب تک اللہ قوت عطا نہ کرے کسی شخص میں فعل کی کوئی قوت پیدا نہیں ہو سکتی چنانچہ سر آمد موحدین رئیس المتقین حضرت محی الدین عبد القادر جیلانی اپنی تصنیف فتوح الغیب میں مقالہ سوم میں فرماتے ہیں۔**لانا علیٰ فی الحقیقۃ اِلَّا اللہ** یعنی درحقیقت اللہ تعالیٰ کے سوا اس کائنات میں کوئی فاعل نہیں ہے۔

سارا قرآن از اول تا آخر اس حکم سے معمور ہے کہ اللہ کے سوا کسی کو مت پکارو۔

صرف دو تین آیتیں درج کرتا ہوں۔

وَلَا تَدْعُ مِنْ دُوْنِ اللہِ مَا لَا یَنْفَعُکَ وَلَا یَضُرُّ کَ اور اللہ کو چھوڑ کر کسی کو مت پکار کیونکہ من دون اللہ جو بھی ہے (خواہ رسول ہو یا ولی) وہ نہ تجھے نفع پہنچا سکتا ہے نہ نقصان (سورۃ یونس آیت ۱۰۶)

وَلَا تَدْعُ مَعَ اللہِ اِلٰھًا اٰخَرَ ہ لَا اِلٰہَ اِلَّا ھُوَج اور اللہ کے ساتھ کسی دوسرے الٰہ کو مت پکار (کیونکہ) اللہ کے سوا (اس کائنات میں) دوسرا الٰہ (نافع یا ضار)

موجود نہیں ہے (۲۸_۸۸)

فَلَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَتَكُوْنَ مِنَ الْمُعَذَّبِيْنَ پس اللہ کے ساتھ کسی دوسرے اللہ کو مت پکار۔ اگر ایسا کرے گا تو بلاشبہ تو عذاب پانے والوں میں سے ہو جائے گا (۲۶_۲۱۳)

قرامطہ کا مقصد مسلمانوں کو توحید سے منحرف کر کے مشرکین کی صف میں داخل کرنا تھا اس لئے ان کے روحانی اور دینی پیشوا عبداللہ ابن سباء نے حضرت علیؓ کو خدا بنالیا۔ اور اگرچہ حضرت علیؓ نے اسے قتل کر دیا مگر وہ مرتے مرتے شرک کا بیج اسلام کی زمین میں بو گیا۔ قرامطہ اسی بیج کا درخت تھے جس کے اثمار تلخ سے ہم چودھویں صدی میں مستفید ہو رہے ہیں۔

اسلام کی امتیازی صفت یہ تھی کہ یہ دین انسان پرستی کی لعنت سے پاک تھا۔ عبداللہ بن سباء اور اس کے جانشینوں القداح اور حمدون قرمط نے انتہائی چابکدستی کے ساتھ اسلام کو اسی امتیازی صفت سے محروم کر دیا۔ ہندوؤں کے یہاں رام اور کرشن خدا کے اوتار ہیں قرامطہ کے یہاں اسماعیل اور علی خدا کے اوتار ہیں وہ بوقت مصیبت رام کو پکارتے ہیں اور یہ بوقت مصیبت علیؓ کو پکارتے ہیں۔ خدا وہاں بھی معطل ہے۔ یہاں بھی، انہی قرامطہ کی تقلید میں اکثر مسلمان حضرت علیؓ کو مشکل کشا سمجھتے ہیں اور ہر مشکل کے وقت خدا کے بجائے انہیں پکارتے ہیں اور جو مسلمان انہیں اس فعل سے منع کرتا ہے اسے وہابی کہتے ہیں۔

قرامطہ نے صوفی بن کر مسلمانوں کو جس حد تک گمراہ کیا، عمل صالح اور جد وجہد سے بیگانہ بنالیا۔ اس کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ انہوں نے ''نادِعلیاً'' سے دنیا جہان کی تاثیر منسوب کر دی میں اپنے دل پر جبر کر کے بلکہ پتھر کی سل رکھ کر جواہر غیبی سے ان کلمات کے خواص نقل کرتا ہوں:۔

خواص ایں کلمات بسیار است

1- اگر مسحور ہفت بار بر آب چاہ بخواند واز اں غسل کند، سحر باطل شود

2- اگر اول ساعت جمعہ چہل وہشت بار بخواند باہر کہ سخن راند محب اوشود

3- اگر از دشمن خوف باشد ہر روز ہفتاد بار بخواند، دشمن مقہور شود

4- برائے اخلاص محبوس ہر روز شصت بار بخواند

5- برائے حصول دولت ہر بامداد صد بار بخواند

6- برائے رویت آنحضرت صلعم ہر شب سہ ہزار بار بخواند

7- برائے کشف کنوز واسرار غیب چہل روز، ہر روز شصت وہفت بار خواند

8- برائے تحصیل علوم ہر روز ہفتاد بار خواند

9- برائے بغض وعداوت میان دو شخص بست بار بخواند

10- برائے تحصیل مرادات ہر روز بست وچہار بار بخواند ص ۱۴۱ وص ۱۴۲

بخوف طوالت صرف انہی خواص پہ اکتفا کرتا ہوں۔ کتاب میں اسی قدر خواص اور بھی مرقوم ہیں ان خواص پر تنقید کے بجائے یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اسی قسم کے تصوف نے مسلمانوں کو قوت عمل سے محروم کر دیا۔ یہ سوال خارج از بحث ہے کہ ان کلمات میں بہت تاثیر کہاں سے ثابت ہے کیونکہ اس قسم کے اسرار ورموز فہم انسانی سے بالاتر ہیں۔

ایک بات اور عرض کروں۔ اس روایت کے واضع نے کمال دانائی سے حضرت علی کا مرتبہ سرکار دو عالم ﷺ سے بڑھا دیا اور واضع کا اصلی مقصد یہی تھا کہ مرکز توجہ حضور انور ﷺ کی جانب سے ہٹ کر حضرت علی کی طرف منتقل ہو جائے نہ اللہ سے تعلق باقی رہے نہ رسول اللہ سے۔

یہ ایک روایت ہے اُن صد ہا روایات لایعنی میں سے جنہوں نے مسلمانوں کے عقائد میں شرک کی آمیزش کر دی اور قرامطہ نے یہ کارنامہ تصوف کا لبادہ اوڑھ کر انجام دیا عوام جب ان کی مجلسوں میں جاتے تھے تو یہ لوگ پہلے ان کو اپنے ظاہری تقدس سے مسحور کرتے تھے۔ پھر ان کے عقائد کو غیر اسلامی تصوف کے سانچے میں ڈھال دیتے تھے۔

نظر اُن کی رہی مجلس میں بس حشو وزوائد پر
گرا کیں چپکے چپکے بجلیاں دینی عقائد پر

اگر تصوف اسی بات کا نام ہے کہ مسلمان خدا پرستی کے بجائے شخصیت پرستی میں بند ہو جائے تو ایسے تصوف سے ہر سچا مسلمان ہزار بار اللہ کی پناہ طلب کرے گا۔

قرامطہ نے فصوص الحکم فتوحات مکیہ مثنوی مولانا روم احیاء العلوم اور دوسری مشہور کتابوں میں اپنی طرف سے عبارتیں اور اشعار دخل کر دیئے بلکہ بہت سی کتابیں خود لکھ کر بعض بزرگوں کے نام سے منسوب کر دیں مثلاً ایک دیوان حضرت علی سے منسوب کر دیا۔ بہت سی رباعیات مختلف صوفیوں سے منسوب کر دیں، مثلاً یہ مشہور رباعی حضرت خواجہ معین الدین اجمیری سے منسوب کر دی۔

شاہ است حسین بادشاہ ہست حسین
دین است حسین دین پناہ است حسین
سر داد نداد دست در دست یزید
حقا کہ بنائے لا الہ ہست حسین

قرامطہ نے بہت سی غزلیں مولانا روم کے دیوان میں شامل کر دیں جس کا نام دیوان شمس تبریز ہے۔ ایک غزل کے چند اشعار ذیل میں درج کرتا ہوں

شاہے کہ ولی بود و وصی بود علی بود
سلطان سخاو کرم وجود علی بود
ہم اول و ہم آخر و ہم ظاہر و باطن
ہم موعد وہم وعدہ و موعود علی بود
گویند ملک ساجد و مسجود بد آدم
از من بشنو ساجد و مسجود علی بود
ہم آدم وہم شیث و ہم ایوب وہم ادریس
ہم یوسف و ہم یونس و ہم ہود علی بود
جبریل کہ آمد زبر خالق بیچوں
در پیش محمد شد وتابود علی بود
ایں کفر نباشد سخن کفر نہ این است
تا ہست علی باشد و تا بود علی بود

مرشد رومی ہرگز یہ غزل نہیں لکھ سکتے تھے کیونکہ دوسرے شعر کا پہلا مصرع گھڑوائے نص قرآنی ھو الاول و الاخر و الظاھر و الباطن ۔اللہ تعالٰی کی صفات پر شاہد ہے اور کوئی مسلمان اس نص کو غیر اللہ کی ذات پر منطبق کرنے کی جسارت نہیں کرسکتا یہ کام وہی شخص کرسکتا ہے جو حضرت علی کو خدا یا خدا کا اوتار سمجھتا ہے اور عبداللہ ابن یسار کی اور اس کے متبعین القداح اور قرمط کی تعلیم کا سنگ بنیاد دعی الوہیت علیؑ کا عقیدہ ہے لہذا یہ غزل انہی کے پیرو لکھ سکتے ہیں۔ چند اشعار اور بھی درج کرتا ہوں۔

اول و آخر توئی ظاہر و باطن توئی
مُحر عالم توئی شاہ سلام علیک
با حیدر خود حیدرم بیرون زحیدر کا فرم
حق را بحق من عرف از شاہ مردان یافتم
اے رہنمائے مومناں، اللہ مولانا علی
اے عیب پوش و غیب دان اللہ مولنا علی
قاضی و شیخ ومحتسب دار دبدل بغض علی
ہر سہ شد نداز دیں بری اللہ مولانا علی

مرشد رومی یہ اشعار ہرگز نہیں لکھ سکتے تھے کیونکہ غیب پوش اور غیب دان یہ اللہ کی صفات ہیں نہ کہ حضرت علیؓ کی۔

دیوان شمس تبریز پر جلال ہمائی نے جو مقدمہ لکھا ہے اس میں ان اشعار کو الحاقی قرار دیا ہے (دیکھو مقدمہ ص ۶۷ دیوان شمس تبریز مطبوعہ طہران ۱۳۳۵ء شمسی)

خواجہ اجمیریؒ یا مرشد رومیؒ کی سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کیا حقیقت ہے! قرامطہ اور ان کے ہم خیالوں نے تو اس قدر جسارت کی کہ اپنے مزعومات باطلہ احادیث نبوی کے لباس میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کر دیئے منجملہ ان کے یہ حدیث ہے جو ترمذی میں بھی موجود ہے۔ انا مدینۃ العالم یا انا دار الحکمۃ وعلی بابھا

شیخ الاسلام آیۃ من آیت اللہ مجاہد اعظم حضرت سیدی وشیخی ومولوی سید حسین احمد صاحب مدنی قدس سرہ العزیز مکتوب نمبر ۵۷ میں صفحہ نمبر ۱۷۹ پر تحریر فرماتے ہیں۔ یہ روایت

نہ تو صحیحین میں ہے اور نہ روایت کا ذکر کرنیوالے اس کی تصحیح فرماتے ہیں۔ترمذی نے بھی روایت کرنے کے بعد کلام کیا ہے کہ بعض علماء نے یہ حدیث شریک تابعی سے روایت کی ہے مگر علمائے حدیث اس کو ثقات میں سے نہیں پہچانتے۔سوائے شریک کے علامہ ابن جوزی نے موضوعات میں اس کے جملہ طرق پر یقین کے ساتھ باطل ہونے کا حکم دیا ہے۔ایک جماعت محدثین کی اس کے موضوع ہونے کی قائل ہے۔

امام الجرح والتعدیل یحیٰی بن معین صاف فرماتے ہیں۔کہ اس روایت کی سرے سے کوئی اصل ہی نہیں ہے۔طاہر پٹنی نے بھی اس کی صحت کا انکار کیا ہے .. امام العصر مولانا انور شاہ صاحب بھی روایت کی صحت کو تسلیم نہیں فرماتے (حاشیہ از مولنا نجم الدین صاحب اصلاحی مرتب مکتوبات شیخ الاسلام) (ماخوذ از مکتوبات شیخ الاسلام حصہ اول - اردو بک اسٹال لاہور)

صوفیہ کے اشعار میں تدلیس اور الحاق کی وبا اس قدر عام ہوچکی تھی کہ جب مولانا جامیؒ بغداد آئے تو ان دنوں وہاں روافض کا ہجوم تھا انہوں نے مولانا کی کتاب سلسلۃ الذہب پر چند اعتراضات کئے تھے۔ایک رافضی نے حضرت علی کی شان میں چند مبالغہ آمیز اشعار لکھ کر مولانا سے منسوب کر دیئے۔

ایک دن جامع مسجد بغداد میں مجلس مناظرہ قائم ہوئی جس کا مقصد یہ تھا کہ روافض اپنے اعتراضات پیش کریں گے مگر پہلے ان اشعار پر اعتراض ہوا جو ایک رافضی نے مولانا سے منسوب کر دیئے تھے سنی علماء نے ان اشعار پر اعتراض کیا۔

اس داستان کی تفصیل کے لئے دیکھو حیات جامی مولفہ ڈاکٹر علی اصغر حکمت مطبوعہ طہران ص ۸۴۔

مجھے اس واقعہ سے صرف یہ دکھانا مقصود تھا کہ اسمٰعیلیہ قرامطہ اور روافض کا یہ محبوب مشغلہ تھا کہ وہ صوفی شعراء کے کلام میں حضرت علی کی شان میں ایسے مبالغہ آمیز اشعار جن سے الوہیت علی پر استدلال ہو سکے، اپنی طرف سے شامل کر دیا کرتے تھے۔ اگر یہ سوال ہو کہ انہیں اس کی جرأت کیسے ہوتی تھی تو اس کا جواب یہ ہے کہ تمام صوفی سلسلے اور تمام صوفی فراد بلا استثناء اعدے حضرت علیؓ کو نہایت مکرم، محترم اور لائق توقیر سمجھتے ہیں۔ اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ سلاسل اربعہ میں سے تین سلسلے حضرت علیؓ پر منتہی ہوتے ہیں۔ لہذا صوفی شعراء نے جہاں خلفائے ثلاثہ کی منقبت میں زور قلم صرف کیا ہے وہاں حضرت علیؓ کی منقبت میں بھی اپنی عقیدت کا مظاہرہ کیا ہے اس لئے روافض اور قرامطہ کو مبالغہ آمیز اشعار شامل کلام کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آسکتی تھی۔ فرض کیجئے مولانا جامی نے اکیس شعر کی ایک نظم حضرت علی کی شان میں لکھی تو اگر کوئی شخص دو تین ایسے شعر جن میں حضرت علی کو خدا بنا دیا گیا ہو اس نظم میں چپکے سے شامل کر دے (اور اسی کو تدسیس کہتے ہیں) تو کیا دشواری لاحق ہو سکتی ہے۔؟

قرامطہ نے مسلمانوں کو گمراہ کرنے کے لئے جہاں اور ہتھکنڈے استعمال کئے وہاں یہ حربہ بھی استعمال کیا کہ اپنی مجلسوں میں مسلسل اس گمراہ کن عقیدے کی تبلیغ کی کہ شریعت اور طریقت دو جداگانہ چیزیں ہیں اور جب ایک شخص طریقت کے دائرے میں قدم رکھتا ہے تو اس کے لئے شریعت کی پابندی لازمی نہیں رہتی جی چاہے پابندی کرے جی چاہے نہ کرے۔''

ملوکیت نے دین اور دنیا میں تفریق تو پہلے ہی سے قائم کر دی تھی اور اس غیر اسلامی تعلیم نے مسلمانوں کی اجتماعی اخلاقی اور دینی زندگی کو تباہ کر دیا تھا۔ رہی سہی کسر اس غیر اسلامی تصوف نے پوری کر دی کیونکہ شریعت اور طریقت کی تفریق سے اباحت مطلقہ کا

دروازہ کھل گیا اور مسلمانوں کی روحانی زندگی ختم ہو کر رہ گئی۔

قرامطہ کو اس تفریق کی ضرورت اس لئے بھی پیش آئی کہ اگرچہ انہوں نے مصلحتاً تصوف کا لبادہ اوڑھ لیا تھا مگر دل تو بدستور غیر اسلامی تھا۔ اس لئے انہوں نے اس نکتہ معرفت کو شدومد کے ساتھ پیش کیا تا کہ کوئی شخص ان پر عدم پابندی شرع کا الزام عائد نہ کر سکے علاوہ بریں ان جعلی صوفیوں کے حاشیہ نشینوں نے عوام کو یہ کہہ کر گمراہ کیا کہ نماز پنج گانہ تو عوام کے لئے ہے یہ حضرات تو ہر وقت نماز میں مشغول رہتے ہیں۔

اس تعلیم کا نتیجہ یہ نکلا کہ رفتہ رفتہ مسلمانوں میں قلندری اور ملامتی درویشوں کی جماعتیں پیدا ہو گئیں ان دونوں جماعتوں کے افراد، پابندی شریعت سے آزاد رہتے تھے بلکہ اس آزادی میں فخر محسوس کرتے تھے اور تحقیر شریعت کو اپنے لئے طغرائے امتیاز بناتے تھے۔ قلندروں کی جماعت نے سیاحت اور صحرانوردی کو اپنا شعار بنایا، کیونکہ اس طرح سیر و تفریح کے مواقع بھی بآسانی میسر آسکتے تھے اور جدوجہد کے بغیر زندگی بسر ہو سکتی تھی۔ یعنی جس شہر میں پہنچے وہاں کے مسلمانوں پر اپنے تقدس (ترک دنیا) کا سکہ جما کر اعلیٰ درجے کی ضیافت کا انتظام کر لیا۔ رفتہ رفتہ ان کے اخلاق بالکل تباہ ہو گئے بخوف طوالت تفصیل سے اجتناب کرتا ہوں۔

رہے ملامتی فرقے کے لوگ تو انہوں نے اسلام اور مسلمانوں کو سب سے زیادہ ضعف پہنچایا کیونکہ دین کی بنیاد ہی منہدم کر دی انہوں نے ہر اس فعل کا ارتکاب کیا جس کی شریعت نے ممانعت فرمائی ہے۔ قرامطہ نے ان کو یہ نکتہ عجیبہ جسے ابلیسی ذہانت کا شاہکار کہنا زیادہ مناسب ہوگا، سمجھایا کہ

1- تصوف کا مقصود ہے نفس امارہ کو مغلوب کرنا۔

-2 اس کے مغلوب کرنے کا ایک طریقہ اس کی تذلیل بھی ہے۔

-3 اس لئے ایسے کام کرو جن کی وجہ سے لوگ تمہیں برا کہیں۔

-4 جب لوگ تمہیں برا سمجھیں گے گالیاں دیں گے، دین اسلام سے خارج کر دیں گے تمہارا سوشل بائیکاٹ کریں گے تو یقیناً نفس امارہ، نفس مطمئنہ میں تبدیل ہو جائے گا۔

چونکہ اتباع شریعت نفس پر گراں ہے اس لئے یہ ملامتی طریقہ بہت جلد مقبول ہو گیا اور آج بھی ہندو پاکستان کے مختلف شہروں میں آپ کو ایسے لوگ مل سکتے ہیں جو

-1 اعلانیہ شریعت اور طریقت میں تفریق کرتے ہیں اور پیر ہونے کے باوجود نہ نماز پڑھتے ہیں نہ روزہ رکھتے ہیں نہ اتباع شریعت کرتے ہیں وجہ کیا ہے؟ صرف یہ کہ وہ کہتے ہیں کہ اب ہم روحانیت کے اس مقام پر فائز ہیں جہاں یہ رسوم ظاہری بے کار ہو جاتی ہیں اور اپنے زعم باطل کی تائید میں یہ آیت پیش کر دیتے ہیں۔

وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَأْتِيَكَ الْيَقِيْنُ

یعنی اپنے رب کی اس وقت تک عبادت کر جب تک تجھ میں یقین کی کیفیت پیدا نہ ہو اس کے بعد وہ کہتے ہیں کہ چونکہ ہمارے اندر یقین پیدا ہو چکا ہے۔ اس لئے اب ہمیں عبادت کی ضرورت نہیں ہے حالانکہ افضل الرسل خیر البشر سرکار دو عالم آخر وقت تک نماز پڑھتے رہے۔

-2 جو درویشی کے پردے میں منہیات کا ارتکاب کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ ہم اسی لئے تو شراب پیتے ہیں کہ لوگ ہمیں برا سمجھیں اور اس طرح ہمارا نفس مردہ ہو جائے جو مقصود اسلام ہے۔

یہ بے شرع اور خلاف شرع، صوفی جو در اصل ملاحدہ اور زنادقہ کی جماعت کے دو

فراد ہیں پانچویں صدی سے دنیائے اسلام میں اپنی فتنہ پردازی اور شرارت انگیزی میں مصروف ہیں۔ میں صرف ایک شخص کا ذکر کروں گا جس کا نام مادھولال حسین ہے۔ یہ شخص اکبر کے عہد میں لاہور میں رہتا تھا ایک طرف لپنے اشعار میں خالص توحید اور عشق الٰہی کا درس دیتا تھا۔ دوسری طرف ایک کھتری بچہ مادھو کے عشق میں گرفتار تھا اور بلا تامل خلاف شرع امور کا ارتکاب کرتا تھا۔

ملامتی فرقے کے درویش لاہور کے علاوہ دلی میں بھی تھے۔ اسی لئے حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ جو صوفی شریعت اور طریقت میں فرق کرے وہ صوفی نہیں ہے بلکہ فرقہ باطنیہ سے تعلق رکھتا ہے میرا خیال ہے کہ میں نے اپنے دعوے کے ثبوت میں کافی سے زیادہ شواہد پیش کر دیے ہیں۔

دعائے مغفرت

گوجرانوالہ سے بھائی محمد صدیق مغل

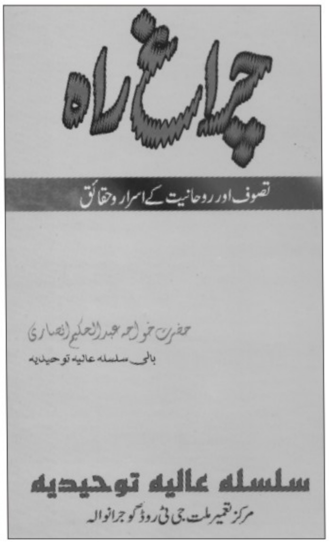
گوجرانوالہ سے رانا عمران کے چچا

آدم کے چیمہ سے جاوید بٹ کی اہلیہ

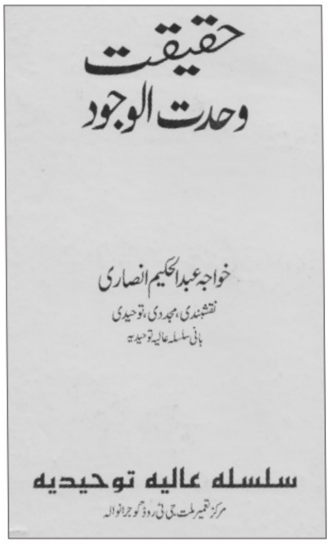
بقضائے الٰہی وفات پا گئے ہیں (اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعوْنَ)

مرحوم کی مغفرت اور بلندی درجات کیلئے دعا فرمائیں۔

بانی سلسلہ عالیہ توحیدیہ خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ کی شہرہ آفاق تصانیف

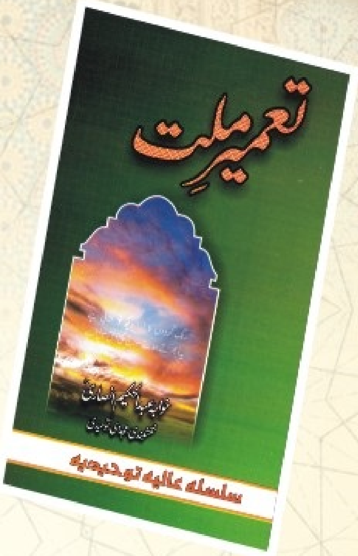


کتاب ہذا بانی سلسلہ خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ کے خطبات پر مشتمل ہے۔ جو آپ نے سالانہ اجتماعات پر ارشاد فرمائے اسمیں درج ذیل خصوصی مسائل پر روشنی ڈالی گئی۔ سلوک وتصوف میں ذاتی تجربات، مرشد کی تلاش کے دس سالہ دور کا حال۔ زوالِ اُمت میں اُمراء، علماء، صوفیاء کا کردار۔ علماء اور صوفیاء کے طریق اصلاح کا فرق۔ تصوف خفتہ اور بیدار کے اثرات اور تصوّف کے انسانی زندگی پر اثرات۔ سلسلہ عالیہ توحیدیہ کے قیام سے فقیری کی راہ کیونکر آسان ہوئی۔

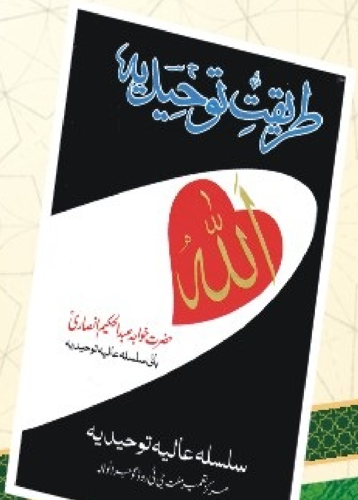


وحدت الوجود کے موضوع پر یہ مختصر سی کتاب نہایت ہی اہم دستاویز ہے۔ مصنّفؒ نے وحدت الوجود کی کیفیت اور روحانی مشاہدات کو عام فہم دلائل کی روشنی میں آسان زبان میں بیان کردیا ہے۔ آپ نے جن دیگر موضوعات پر روشنی ڈالی ہے وہ یہ ہیں:۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کا نظریہ وحدت الشہود، انسان کی بقاء اور ترقی کیلئے دین کی اہمیت اور ناگزیریت، بنیادی سوال جس نے نظریۂ وحدت الوجود کو جنم دیا اور روحانی سلوک کے دوران بزرگان عظّام کو ہوجانے والی غلط فہمیاں۔

سلسلہ توحیدیہ کی مطبوعات



قرونِ اولیٰ میں مسلمانوں کی بے مثال ترقی اور موجودہ دور میں زوال وانحطاط کی وجوہات، اسلامی تصوّف کیا ہے؟ سلوک طے کرنے کا عملی طریقہ، سلوک کا ماحصل اور سلوک کے ادوار، ایمان محکم کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ عالم روحانی کی تشریح، جنت، دوزخ کا محلِ وقوع اور ان کے طبقات کی تعداد، انسانی روح کی حقیقت کیا ہے؟ روح کا دنیا میں آنا اور واپسی کا سفر، اسلامی عبادات، معاملات، اور اخلاق وآداب کے اسرار ورموز اور نفسیاتی اثرات، امت مسلمہ کے لئے اپنے کھوئے ہوئے مقام کے حصول کیلئے واضح لائحہ عمل۔



یہ کتاب سلسلہ عالیہ توحیدیہ کا آئین ہے۔ اس میں سلسلے کی تنظیم اور عملی سلوک کے طریقے تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ جو لوگ سلسلہ میں شامل ہونا چاہتے ہیں انہیں یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہئے۔ حضرت خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ نے تصوف کی تاریخ میں پہلی مرتبہ فقیری کا مکمل نصاب اس چھوٹی سی کتاب میں قلم بند کردیا ہے۔ اس میں وہ تمام اوراد، اذکار اور اعمال واشغال تفصیل کے ساتھ تحریر کردیئے ہیں جس پر عمل کرکے ایک سالک اللہ تعالیٰ کی محبت، حضوری، لقاء اور معرفت حاصل کرسکتا ہے۔

Reg: CPL - 01
Website www.tauheediyah.com